فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ

فلسفہ

تمدنِ اسلام

مصنفہ

عبد الباسط ایم اے ایل ایل بی

فیلو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مرتب تسہیل الدراستہ پس پردہ وغیرہ

پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

جس میں

نظریۂ تمدن سے مکمل بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی تمدن دنیا کے تمدنوں میں بہترین اور عقل و ضرورت انسانی کے بالکل مطابق ہے

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوا
۱۹۲۷ء ۱۳۴۶ھ

طبع اول ایک ہزار

قیمت فی جلد (عہ)

فلسفۂ

تمدّنِ اسلام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

ایک عرصہ ہوا میں بی اے کا طالب علم تھا میں نے ایک مضمون بعنوان "نظریۂ تمدن" حسب فرمائش فلاسفیکل سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تحریر کیا تھا۔ جو انجمن مذکور کے ایک جلسہ میں پڑھا اور پسند کیا گیا۔ بعد ازاں اسی سلسلہ میں ایک مضمون مقابلہ "فلسفۂ تمدن اور اسلام" کے عنوان سے جناب صدر انجمن میاں محمد شریف صاحب پروفیسر فلسفہ نے تجویز فرمایا۔ چنانچہ اس مبحث پر مجھے بھی کچھ لکھنے کی ہمت ہوئی۔ حسن اتفاق سے ممتحن مقابلہ نے میرے مضمون کو بہت پسند کیا اور وہ تمغہ طلائی جو اسی مقابلہ کے لیئے تجویز کیا گیا تھا باتفاق رائے میرے ہی حصہ میں آیا۔ اس ہمت افزائی کے بعد مجھے جرأت ہوئی

کہ میں اسی مضمون پر نظر ثانی کرکے اس کو ایک مبسوط مقالہ کی صورت میں تبدیل کردوں۔ چونکہ مجھے اس مبحث خاص سے ذاتی ذوق تھا اس لیئے بیحد جانفشانی اور ورق گردانی کے بعد خدا کا شکر ہے کہ وہ مقالہ اس قابل ہو گیا کہ کتاب کی صورت میں ہدیہ ناظرین کیا جاسکے۔

قبل ازیں کہ اس کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے، میں نے مناسب سمجھا کہ اس کے متعلق دیگر ارباب فضل کا بھی مشورہ حاصل کروں۔ چنانچہ من جملہ ان عرفاء کے جنھوں نے اس کی اشاعت کے متعلق راقم الحروف کی ہمت افزائی فرمائی مولوی عبدالماجد صاحب (فلسفی) اور سید سلیمان صاحب (ندوی) کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کتاب ہذا کے اکثر حصص باقساط معارف کے مختلف نمبروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اسی وقت سے احباب کا اصرار تھا کہ اس کو مستقل تصنیف کی حیثیت سے کتابی صورت میں پبلک کے سامنے پیش کیا جائے لیکن وہ مشکلات جو ایک مصنف کو بالعموم پیش آسکتی ہیں ان سے میں بھی مستثنےٰ نہ ہو سکا اور یہی وجہ ہے کہ کتاب کی اشاعت میں اس قدر تعویق ہو گئی۔

اس موقع پر یہ بھی عرض کر دینا بے موقع نہ ہوگا کہ چونکہ بہ حیثیت ایک مستقل تصنیف

کے یہ میرا نقش اولیں ہے لہذا کسی لغزش کا ارتکاب بعید از قیاس نہیں ہو سکتا ممکن ہے حسب مفاد مقولہ عربی مَنْ صَنَّفَ فَقَدِ اسْتَهْدَفَ میں ارباب ذوق کی نگاہوں میں کسی فروگزاشت کا جواب دہ قرار دیا جاؤں لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا خلوص جو اس تصنیف کا باعث ہوا ہے عذر خواہ بن کر میری برارت کی سند حاصل کر لیگا۔ اور موضوع کتاب کی اہمیت جزوی لغزشات کے دھبوں کو دامن کتاب سے محو کر دیگی۔

بقول ابن درید من لك؟ بالمهذب الندب الذي + لا يجد العيب اليه مختطى۔ فلسفہ تمدن اسلام کی اشاعت کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اسلامی تمدن کے محاسن پر مادیت نے جو پردہ ڈال دیا ہے وہ اٹھا دیا جائے تاکہ اس کی اصلی اور حقیقی خوبیوں سے نگاہیں محروم نہ رہیں اور جو غلط فہمیاں اسلامی تمدن کے متعلق دلوں میں راسخ ہو گئی ہیں رفع ہو کر وہ روشن پہلو جس کو روحیت یا روحانیت سے تعبیر کرتے ہیں نمایاں ہو جائے۔

یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ صرف یہ مختصر تصنیف ہماری ضروریات تمدن کے لئے من حیث المجموع کافی نہیں بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کے قریب تر متعلقات پر بھی نظر ڈال کر احترام معاملات اور حسن سلوک کے فرائض عامہ پر بھی پوری روشنی ڈالی جائے۔ لہذا اگر میری یہ پہلی کوشش کامیاب ہوئی اور ارباب نظر نے ہمت افزائی فرمائی تو انشاء اللہ بہت جلد میں اس

بحث خاص پر بھی کچھ رسالے لکھنے کی کوشش کرونگا اور ایک ایسا مکمل آئینہ جو تمدن اسلام کو اس کی اصلی صورت میں ظاہر اور نمایاں کرسکے پیش کرونگا۔

سب سے آخر میں طباعت کی تسامحات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صرف اس قدر عرض کردینا مناسب خیال کرتا ہوں کہ حسب مقولہ "قلم در کف دشمن است" کتاب باوجود سعی بلیغ کے کتابت کی غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔ جن حضرات کو کاتبوں سے قبل ازیں سابقہ پڑ چکا ہے وہ میری کشمکش و پریشانی کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ بہت سے کاتبوں کو صرف غلط تحریر کرنے ہی کی عادت نہیں بلکہ اکثر اوقات اپنی جودت طبع سے مجبور ہوکر اصلاح بھی کردیا کرتے ہیں لہٰذا اس سلسلے میں بھی جو غلطیاں رہ گئی ہیں ان کا ذمہ دار بھی میں اپنے ہی آپ کو قرار دیکر عذر خواہ ہوتا ہوں۔

آخر میں میں اپنے مکرم دوست جناب سید محمد ہادی صاحب مچھلی شہری بی اے ایل ایل بی کا بدل ممنون ہوں جنھوں نے اس ناچیز تصنیف کو اپنے عالمانہ مقدمہ سے مزین فرمایا۔

گر بد و گر نیک فگندم بہ پیش
پوش بدامن بہ نکوئی خویش

راقم الحروف۔ عبدالباسط ایم اے ایل ایل بی
فیلو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۸۔ اگست سنہ ۱۹۲۷ء

مُقدّمہ

میرے عزیز دوست مولوی عبدالباسط صاحب ایم اے ایل ایل بی. جو ماشاء اللہ ابھی نوجوان ہیں علم ادب سے خاص دلچسپی و رشوق رکھتے ہیں آپ اُن باذوق فضلا میں سے ہیں جن کی ذات سے ادبِ اُردو کی آیندہ اُمیدیں بہت کچھ وابستہ ہیں آپ نے جو کتاب فلسفہ تمدّنِ اسلام کے نام سے تصنیف کی ہے اور جس کو اب شائع کر رہے ہیں ادبِ اُردو میں ایک مہتم بالشان اضافہ ہے اور ان فرایض کی ادائیگی کی پہلی قسط ہے جن کا ہر تعلیم یافتہ مسلمان بہ حیثیت مسلمان ہونے کے ذمہ دار ہے۔

تعلیم کا یہ مقصد ہے کہ اس کے ذریعہ سے انسان اپنی اصلیت کو پہچان سکے نہ کہ اس منزلِ حقیقی سے اور بھی دور ہو جائے۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے آج کل کی تعلیم کا نتیجہ مغربی حسیات کی تقلید اور خود فراموشی کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارا نظریہ تعلیم اب صرف اسی قدر رہ گیا ہے کہ اہلِ یورپ کی تقلید کر کے ان کی صدائے بازگشت بن جائیں اور اپنی ہستی کو ان کی ہستی میں اس طرح محو کر دیں کہ دنیا کی نگاہوں میں ہم میں اور ان میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے۔ جب ہمارے رجحانات، ہمارے محسوسات اور ہماری افتادِ طبیعت کا یہ رنگ ہو تو اگر کوئی متنفس ہم میں سے محسوسات عامہ کے خلاف اپنے پہچاننے کی کوشش کرے تو اس کی حیثیت یقیناً ایک مجاہد سے کم نہ ہوگی اور اس لحاظ سے ہمارے عزیز دوست بھی جنھوں نے اس دورِ خود فراموشی میں اپنے کو پہچاننے کی کوشش کی ہے بلا تردید اس مبارک لقب کے مستحق ہیں۔

جہاں تک دیکھا جاتا ہے معاشی ترقی اور معادی معراج کا ذریعہ صرف دو چیزیں ہو سکتی ہیں۔ مادیات اور روحیات اور انھیں دونوں کے مناسب امتزاج کا نام اصلی اور حقیقی تمدن ہے۔ مادیت کا یہ کام ہے کہ معیشت اور گزرانِ زندگی کے ذرائع پیدا کرے اور روحیت کا یہ فعل ہے کہ اس کے حدود قایم کر کے اسے لطائف

احسن مفید اور کارآمد بنائے۔ بغیر روحیت کی مدد کے مادیت تعدیل نہیں پیدا کرسکتی اور نہ اس کی مخفی قابلیتیں جو تمدن صحیح کا جزو لاینفک ہیں ظاہر ہوسکتی ہیں۔ اگر ہم اس کلیہ کو صحیح باور کرلیں تو ہم کو اپنے پیمانے میں مطلق کوئی دقت نہ ہوگی اور ہم یہ بھی بتا سکینگے کہ آیا دیگر اقوام کی تقلید میں ہم حق بجانب ہیں یا نہیں اور اگر بعد تحقیقات ہمارا یہ جواب ہو کہ ہم حق بجانب نہیں تو ہمارے لیئے بہت آسان ہوجائیگا کہ تقلید محض کو بھول بھلیاں سے نکل کر منزل حقیقت کا پتہ لگالیں اور اگر ہمارے مفلوج دست و پا اجازت دیں تو وہاں تک پہونچ بھی جائیں۔

"ہر کمالے را زوالے" ایک نہایت سچا مقولہ ہے جس طرح بری چیزوں کے رواج کا ایک وقت ہوتا ہے اسی طرح اچھی چیزوں کے عروج کا بھی ایک زمانہ ہوتا ہے اور جس طرح بری چیزیں بمقتضائے فطرت رفتہ رفتہ فنا ہوجاتی ہیں اسی طرح اچھی چیزوں کی بھی کساد بازاری ہوجاتی ہے مگر فرق صرف اس قدر ہے کہ بُری چیز کی فنائیت فنائیت حقیقی ہوتی ہے لیکن اچھی چیز کی معدومیت معدومیت اصلی نہیں ہوتی۔ اچھی چیز ہر ارتقائی یا تنزلی حالت میں بجنسہ موجود رہتی ہے وہ روپوش نہیں ہوتی بلکہ ہمارے حسیات کے تبدل کا کمزور پردہ تھوڑی دیر کیلیئے

... پیش کر دیا ہے۔ اور یہ سمجھنے کی ناقابلیت بھی حقیقی نہیں
بلکہ محض معنوی اور غیر مستقل ہوتی ہے جس کا دور کر دینا بھی ہمارے ہی قبضۂ قدرت
میں ہوتا ہے۔ لہذا اگر موجودہ تمدن میں کوئی کمی بھی نظر آئے تو ہمیں مایوس نہ ہونا
چاہیئے بلکہ اس وقت کا انتظار کرنا چاہیئے جب یہ خرابیاں خود بخود اصلاح
پذیر ہو جاتی ہیں۔

...تے ہیں کہ یورپ نے بہت کچھ ترقی کی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی ایجادات
اور اختراعات محیر العقول ہیں لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ آیا اُن سے تمدن حقیقی کو بھی
کوئی فائدہ پہونچا ہے یا نہیں۔ اگر یہ چیزیں انسانیت کی کسوٹی پر بھی پوری اتریں
ہیں تو بے شک ہماری زبان کو کسی اعتراض کا حق حاصل نہیں۔ ورنہ مجبوراً ہمیں
یہی کہنا پڑیگا ؎

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہووے

الغرض جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جو اقوام فی زمانا
نہایت متمدن سمجھی جاتی ہیں وہ موجودہ تنوعات کے محیر العقول پردے میں
بجز چند نقلی تصاویر کے اور کچھ نہیں۔ آجکل کا تمدن فی الحقیقت کوئی حقیقی اور

اصلی تمدن نہیں بلکہ اس روحانی تمدن کا ایک جزو ہوا کرتی ہیں جس کو مدتیں گزریں مسلمان قایم کر چکے تھے۔ یہ امتیاز نہ کرنا کہ اس کا ماخذ کیا ہے خود ہماری آنکھوں کا قصور ہے جن کو مصنوعی ترقی کی چکا چوند نے خیرہ کر کے ہمیں خالی الذہن بنا دیا ہے اور ہم تشنہ لب مسافر کی طرح بلا تفریق و امتیاز حالت و حیثیت ہر چاہ پر اپنی تشنہ لبی دور کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔

صحیح اصول تمدن کے لیے جہاں اسباب معیشت کی سہولت ضروری ہے وہاں روحانیت کا ہونا بھی لازمی ہے اور چونکہ روحانیت کا دار و مدار مذہب پر ہے لہذا کوئی قوم اپنے مذہب سے علیحدہ ہو کر بھی صحیح معنوں میں متمدن نہیں بن سکتی۔ اگر کسی تمدن میں سے مذہبیت کا عنصر جو دیگر عناصر کا نقطۂ ارتباط اور ان کی صحت عمل کا ذمہ دار ہے حذف کر دیا جائے تو تمدن کا ہیولیٰ کبھی اپنی اصلی صورت میں قایم نہیں رہ سکتا۔ اور ایسی حالت میں خود اس کے تمام اجزاے استعماری غیر مربوط ہو کر اس کے استہلاک اور معدومیت کا سبب بن جائینگے۔ چنانچہ بعینہ یہی حالت مغربی تمدن کی بھی ہے اگرچہ اس میں کچھ شک نہیں کہ اسباب معیشت میں بہت کچھ آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں مگر عنصر روحی کے منفک ہو جانے کی وجہ سے بالمآل ان کی فائدہ مندی نقصانات عظیمہ کا ماخذ بن گئی ہے۔ مثلاً

سائنس کی ترقی سے کسی کو انکار نہیں لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی علت غائی کیا ہے تو ہماری تمام خوشیاں افسوس سے بدل جاتی ہیں۔ کیونکہ ان اختراعات روز افزوں کی محرک بجز اس خواہش قہرمانی کے جو ایک کثیر جماعت کی تخریب اور انعدام سے ایک قلیل طبقہ کی تکمیل مقاصد کا سبب بنتی ہے اور کچھ نہیں۔ آج کل صرف وہ قوم جس کے ہاتھ میں زیر دستوں کی تباہی اور بربادی کے بہترین ذرائع موجود ہوں اپنے معاصرین اور ہم چشموں میں متمدن تر سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ جس وقت تک جرمنی کے زپلین اور اس کی سکیم پر ہیں ملک الموت کا ہاتھ بٹاتی رہیں ہر مدعی تمدن کی نگاہیں اسی کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کے اسباب قہرمانی کے فنا ہوتے ہی اس کی عظمت واستقلال بے نہایت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ وہ تمدن جس کی بنیاد صرف غرض رانی اور قہرمانی پر ہو اس کا انجام آخرالامر یہی ہوتا ہے لیکن وہ تمدن جس کی بنیاد روحیت پر ہوتی ہے یا جس کا ہیولے مادیت اور روحیت کے باہمی امتزاج و تعدیل سے بنتا ہے یقیناً لایعنی و لایتغیر ہے۔ ممکن ہے زمانہ کی غبار آلود گردشیں تھوڑی دیر کے لیئے اس کے جمال جہان آرا کا پردہ بن جائیں لیکن اس کے استیصال پر کوئی قوت ہرگز قادر نہیں ہو سکتی۔

الغرض قوائے بہیمیہ اور خواہشات نفسانیہ کے ایک دل پذیر پیرایہ میں مظاہرے کا نام موجودہ تمدن ہے جس کے ریاکاری، دھوکہ، فریب ظاہرداری اور خودغرضی اجزائے استعماری ہیں۔ موجودہ تمدن کے نظریہ کے مطابق، سیاہ کاری صرف اسی وقت تک سیاہ کاری ہے جب تک لوگ اس کا سراغ نہ لگا سکیں یہ رند دنیا ہے کوئی عیب پردے کے اندر عیب نہیں رہ جاتا۔ کون نہیں جانتا کہ وہ نازک ہستی وہ شرم وعفت کی دیوی جس کا نام عورت ہے اپنے حقیقی مرکز سے کس قدر منحرف ہو چکی ہے۔ حسن وجمال جو کبھی اس کے مجازی خدا (شوہر) کا محدود سرمایہ تھا آج گلیوں اور بازاروں میں بے حیا نہ خود فروشی کرتا پھرتا ہے۔ یورپ میں مسابقہ حسن وجمال کی ہنگامہ آرائیوں سے کون واقف نہیں۔ حسن کی نمائش گاہوں کے دلچسپ افسانے کس کے کانوں تک نہیں پہونچ چکے ہیں اور تھیٹروں اور دیگر تماشا گاہوں میں ان نوری لباس والی پریوں کے برہنہ خط وخال کون نہیں دیکھ چکا ہے۔ الغرض صنائع مستظرفہ کی ترقی نے ہر مخفی حسن کو آفتاب نصف النہار بنا دیا ہے۔ اور اگر احترام فطرت کا کچھ دنوں یہی رنگ رہا تو وہ زمانہ دور نہیں جب جسم انسانی ہر آزاد چارپائے کی طرح لباس کے ہلکے سے ہلکے بار کا بھی متحمل نہ ہو سکیگا۔

امانت، صداقت، کفایت، محبت، اخوت اور رواداری کے نام دنیا سے مفقود ہو چکے۔ ہر بری چیز جو مقاصد شخصی کی راہ میں حائل نہ ہو بری نہیں اور ہر اچھی چیز جو اُن کی اغراض کی راہ میں ... بن سکے قابل نفرت اور ملامت ہے ... اور فریب نے ... حکمت عملی کا نام اختیار کر لیا اور خود ... تکبر ... ری اور تہذیب ... نام ... ہو گئے۔ چنانچہ اسلامی نقطہ نظر سے رواداری ... ت اور بین الاقوامی کے متعلق ایک مصنف کا نظریہ ذیل قابل توجہ ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:-

(۱) اسلام نے جب ... پیدا کی اسی طرح غیر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ وسیع واسطی ... کی ہے ... ان کے لیے بھی جب کا ... ضبط کر دیئے ہیں۔ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح ایسے واقعات سے پر ہیں جن میں آپ یہود و نصاریٰ کی عزت فرماتے تھے ان کے جنازے کی مشایعت کرتے تھے۔ ان کی دعوت اور مجالس میں شریک ہوتے تھے اور تمام تمدنی معاملات قائم رکھتے تھے جن کی اسلام نے اجازت دی ہے۔

پیروہی مسلم جب کسی ایسے شہر میں فاتحانہ شان و شوکت کے ساتھ داخل ہوتے تھے جہاں کے باشندے اعتقاداً اور مذہباً مختلف ہوتے تھے تو ان لوگوں کو کافی آزادی دیتے تھے۔ مسجدوں کے سامنے گرجاؤں میں گھنٹے، مندروں میں ناقوس کی اجازت دی جاتی تھی۔ اور اسلامی تمدنی اصول کی پیروی میں دوسرے مذاہب و معتقدات کے اقوام جن کے ساتھ وہ سکونت اور تعلقات قائم رکھتے تھے وہ فیاضانہ سلوک کرتے تھے جس کی نظیر نوع انسانی کی تاریخ میں تلاش و جستجو لاحاصل ہے۔"

(۳) ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین سلطنتوں میں معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی پابندی صرف اسی وقت تک کی جاتی ہے جب تک کہ ان کی منافع حاصل ہونے میں یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر ہوتا ہے لیکن اس کے خلاف عہد شکنی میں ذرا تامل نہیں ہوتا۔ لیکن ایک دیندار محض خدا کے خوف سے کبھی عہد شکنی کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اور معاد کا قائل مستقبل کے خوف سے ایفائے وعدہ میں حتی الوسع کوشاں رہتا ہے۔

فرض کرو کہ دو شخص ہم سفر ہوں جن میں سے ایک کے پاس ایک ہزار
روپیوں کے نوٹ ہوں اور دوسرا محتاج محض ہو اور راستہ
میں پہلے شخص کا انتقال ہو جائے اور مفلس کو اپنے ساتھی کا مال
مل جائے اور اس کی خبر بھی کسی کو نہ ہونے پائے تو اس وقت
تب اس کے دل اور نفس میں باہم جنگ ہوگی۔ اخلاق کا فتوی یہ ہوگا
کہ روپیہ وارث مستحق کو دینا چاہیے اور نفس کا فیصلہ اس کے بالکل
برعکس ہوگا۔ اس موقع پر محض اخلاقی تعلیم رہبری نہیں کر سکتی
چونکہ پولیس کے خوف کا اس کو بالکل اندیشہ نہیں ہے۔ یہاں صرف
وہی شخص باز رہ سکتا ہے جس کے دل میں خوف خلق کی بجائے
خوف خدا جاگزیں ہوگا۔

بہرحال جیسا کہ اوپر اشارہ ہو چکا ہے ہر چیز کے عروج کی ایک حد ہوتی ہے چنانچہ مغربی تمدن بھی خواہ وہ اچھا ہو یا برا اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے اور اس کے زوال کے اسباب ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ یورپ کے منورین اور متفکرین نے محسوس کر لیا ہے کہ ان کا موجودہ تمدن صحیح تمدن نہیں جرمنی امریکہ و دیگر ممالک متنورہ میں ایسی ہستیاں اب پیدا ہو گئی ہیں جن کے خیال میں تنہا مادیت اصلی تمدن

کی کفیل نہیں بن سکتی۔ انکا قول ہے کہ جس طرح مشرق نے صرف روحیت کو اپنا مطمح نظر قرار دے کر اپنے کو برباد کیا۔ اسی طرح اب مغرب صرف مادّیت کو اپنا صید آمال تصور کر کے اپنی معدومیت اور تمامیت کا سامان مہیا کر رہا ہے لہٰذا ابقائے ذات کے لئے لازم ہے کہ ایک درمیانی راستہ اختیار کیا جائے اور روحیت اور مادیت کے امتزاج سے ایسے ذرائع ترقی پیدا کیے جائیں جن پر کبھی اور کسی زمانہ میں کم مائیگی کا الزام عائد نہ ہو سکے اور جو ہر قسم کی ترقی انسانی کی بلا کم وکاست جولاں گاہ بن سکیں۔

چنانچہ جناب مصنف اسی مسئلہ کے متعلق اہل امریکہ کے خیالات حسب ذیل عبارت میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"ہم روزانہ برائے العین مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض ایسے لوگ موجود ہیں جو جسمانی صحت سے متمتع ہیں دولت و ثروت میں قارون ثانی ہیں اور انھوں نے مختلف علوم و فنون کی زبردست تعلیم حاصل کی ہے لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ہر وقت ان کو ایک قسم کی اندرونی گھبراہٹ اور دلی بے اطمینانی اور سخت بے چینی محسوس ہوتی ہے جو ان کی تمام راحتوں اور لذتوں میں کانٹے

اسی طرح شگفتگی بنتی ہے۔ ان کو اپنے دل میں ایسا تکدر و ملال محسوس
ہوتا ہے جس کا کوئی سبب ان کو بظاہر معلوم نہیں ہوتا۔ اور جو صرف
اسی وقت زائل ہوتا ہے جب کہ مذہب کی شراب ناب ہو ... ایک
تسکین بخش کلمہ ان کو مل جاتا ہے۔ . . . .

چنانچہ ڈاکٹر گل امریکہ کے مشہور پروفیسر جو حال ہی میں ہندوستان
بغرض سیاحت تشریف لائے تھے اپنے لکچر میں فرماتے ہیں کہ
امریکہ میں باوجود اس قدر تمول اب جس چیز کی ہر دل میں جستجو اور
تلاش ہے وہ اخلاق، کیریکٹر، مذہب ہے۔

ان کی رائے ہے کہ دنیا میں کوئی شخص خواہ وہ جسمانی یا دماغی
یا مالی کتنی ہی ترقیاں کیوں نہ کرے بغیر کیریکٹر یا مذہب کے ہرگز
قابلِ قدر و منزلت نہیں ہو سکتا۔ اور ایک لامذہب سوسائٹی
کے لیے [illegible] ہوتا ہے جس سے تمدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

الغرض ہم دیکھتے ہیں کہ اہل یورپ کو اب اس کا کافی احساس ہو چکا ہے کہ
ان کو بہت جلد موجودہ تمدن میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے حاصل
کرنے کے لیے متعدد انجمنیں قائم کی گئی ہیں جن کا مطمح نظر وحدتِ خیال اور ہم آہنگی

ہے۔ من جملہ ان انجمنوں کے ایک انجمن، انجمنِ روحیاتِ اجتماعی کے نام سے حال ہی میں بمقام برلن قایم کی گئی ہے علاوہ دیگر شعبوں کے اس کے شعبہائے فلسفی اور تصوفی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ شعبۂ فلسفی کے تحت میں جو مقاصد ظاہر کئے گئے ہیں اُن کی تفصیل سب ذیل ہے :۔

۱۔ اپنے افکار و اعمال کو اس قوت عظمیٰ کی مرضی پر چھوڑ دینا جو کل عوالم کا منبع اور انسان کی روح جاویدان کا مصدر ہے

۲۔ تمام ذی روح موجودات میں بلا لحاظ طبقہ و فرقہ باہمی ارتباط پیدا کرکے اُن کو عالم ملکوت کے ساتھ وابستہ کرنا تاکہ اخوت بین البشری کے اسباب پورے طور پر مہیا ہو سکیں۔

۳۔ نیکی کی خدمت نیکی کی حیثیت سے کرنا اور اس مقصد کے حاصل کرنے میں فکر سلیم اور عقل مستقیم سے کام لینا۔

۴۔ روح اور قوائے مخفیہ کی تکمیل کی کوشش کرنا تاکہ اس کے ذریعہ سے روحیت مادیت پر غالب آسکے۔

۵۔ تمام عزیز و اقربا اور ذی روح موجودات کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرنا

۶۔ امور مذہبی کو امور دنیاوی کے ساتھ متحد و ممزوج کرنا۔

۷۔ دنیا کے تمام مذاہب کی عظمت ثانیہ۔

اس انجمن میں زندگی کے معنی کے متعلق جو تقریریں ہوئیں اُن میں سے ایک کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

اگرچہ زندگی ایک نہایت وسیع حقیقت کا نام ہے۔ مگر انسان اس کی صرف ادنیٰ ترین کیفیت کا احساس کر کے صرف اسی کو تمام میں لا رہا ہے۔ زندگی کے حقیقی معنی ادراک ابدیت روح، تکامل بے حدود اور قناعت منیت کے ہیں اور اس کے حقیقی اغراض صرف قوائے سہ گانہ یعنی عقل، ارادہ اور محبت کے باہمی امتزاج سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

علاوہ اس کے شعبہ تصوف کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ ایک خدا، ایک حقیقت اور ایک مذہب ہے۔ تمام مذاہب جو زمانہ سابقہ میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں حقیقت اسی واحد مذہب کے پرتو ہیں۔

۲۔ صرف ایک خدائے ابدی اور ایک وجود بے مانند موجود ہے اور اس سے خارج کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ لیکن انسان قبل اس کے کہ اس خدائے واحد تک جو مافوق ادراک بشری ہے پہونچ سکے محض اپنی کم بینی کی بنا پر

خدایگانِ مجازی کو حق کا ادراک ممکن ہے اختیار کر لیتا ہے۔ وہ خیال جو خدا کی ذات کے متعلق کیا جاتا ہے ایک ایسا غنچۂ ناشگفتہ ہے جو صرف اس وقت شگفتہ ہوتا ہے جب انسان کو اس کی (خدا) ذات کا ادراک حقیقی ہو جاتا ہے۔

۳۔ دنیا میں صرف ایک رہنما ہے جس کو ہدایت کرنے والی روح کہتے ہیں اور جو اپنے پیروں کو ہمیشہ روشنی کی طرف جذب کرتی ہے۔

۴۔ دنیا میں صرف ایک اصول ہے جس کے معنی بغیر انحراف منزل حقیقی کی جانب براہ راست چلنے کے ہیں اور اسی کے ذریعہ سے ہر روح کے قیام و دوام کا مقصد غائی حاصل ہوتا ہے۔

۵۔ صرف ایک قانون اخلاق ہے جس کو محبت کہتے ہیں اور جو خدا کے "نفس" کی سرزمین سے ایک چشمہ کی طرح ابل کر اعمال نیک کا شیریں پانی اپنے گرد و پیش منتشر کرتا ہے۔

۶۔ صرف ایک حقیقت ہے جس کو معرفت ظاہری و باطنی کہتے ہیں اور یہی تمام اسرار اور حکمات کا جوہر حقیقی اور پرتو اصلی ہے۔

۷۔ مذہب اتحاد باہمی کی تلقین کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے انسان اپنے نفس اپنے محیط اور اپنے خدا کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے اور اس توافق

باہمی کی بنا پر اپنے نفس اور اطراف عالم میں ایسی روشنی پھیلائے جس کے ذریعہ سے جہاں کے درجات عالیہ اور وحدت و محبت کی بلندیاں نصیب ہو سکیں

حافظ

گر نور عشق حق بدل و جانت اوفتد
باللہ کز آفتاب فلک خوبتر شوی

دست از مس وجود چو مردان رہ بشوی
تا کیمیائے عشق بیابی و زر شوی

کیا ان خیالات اور حسیات پر غور کرنے کے بعد کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ تعلیمات تعلیمات اسلام کا جزو نہیں۔ ہمارے قابل مصنف نے بھی اسی نظریہ کے متعلق جا بجا بہت دلچسپ بحث کی ہے جس کے پڑھنے کے بعد کوئی شخص اسلامی تمدن کی غیر محدود برکات سے انکار نہیں کر سکتا۔

وہ لکھتے ہیں:-

(۱)- یہ امر تو اظہر من الشمس ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں رکھتا کہ مسلمانوں کے تمدن کی بنیاد جزیرہ عرب میں قائم ہوئی اور بہت ہی قلیل عرصہ میں اس کی شاخیں تمام ممالک مشرقیہ اور مغربیہ میں پھیل گئیں۔ تمدن کا وہ تخم جو اسلام نے عرب کی سرزمین میں بویا تھا اور جس کا پودا

ابھی نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ ہر چہار طرف سے اس کی بیخ کنی میں تمام
سعی لاحاصل ہوئی اور بالآخر وہ تمام انسانی مخالفتوں میں روحانی
نصرت سے سرسبز ہو کر نکل آیا اور ہوا اس کی روشن دلیل ہے کہ یہ ہمیشہ
کے لئے ہے ....

یہی وہ شجرہ بار آور ہے جس کے شیریں ثمرات سے نہ صرف پیرو
اسلام بلکہ تمام ذی عقل اقوام آج فائز المرام ہو رہی ہیں اور ان
اصول تمدن پر کاربند ہو کر تہذیب دنیا میں آفتاب و ماہتاب کی
طرح چمک رہی ہیں اور تمام ان اقوام کو جنھوں نے ان زریں اصول
کو چھوڑ دیا ہے یا ان کی پیروی میں مذہبی تعصبات سے عدم توجہی
کی ہے - غیر مہذب اور غیر متمدن ہونے کا طعن دے رہی ہیں -

تواریخ اور علوم تمدن کا استقراء کرنے سے ہر شخص اس امر کا پتہ لگا
سکتا ہے کہ مسلمانوں کا تمدن تمام دنیا کے تمدنوں کی نسبت نہایت
سریع السیر، زیادہ شاندار اور عجیب قوی الاثر تھا، اس لئے اور
ہر قسم کی تمدنی صلاح و فلاح کا جامع ہے - مسلمانوں کی ابتدائی حالت
پر منصفانہ سرسری نظر ڈالنے سے یہ تمام باتیں مجسمہ بن کر آنکھوں

کے سامنے آجاتی ہیں۔"

(۲) - واقعات زمانہ اور علوم و عقول اس دعوے کی تائید کرتے ہیں کہ مذہب اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو در اصل طبعی کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ یہاں تک کہ چودھویں صدی میں جو ہر لحاظ سے متمدن و مہذب سمجھی جاتی ہے اس کے نصوص آفتاب سے زیادہ روشن ہو گئے ہیں اور جس طرح شعاع آفتاب پانی میں سرایت کر جاتی ہے اسی طرح وہ نصوص عقول انسانی میں نفوذ کر جاتی ہیں کوئی قاعدہ جو تجربہ سے ثابت ہوا ہو اور کوئی نظریہ جو حواس سے ثابت ہو گیا ہو ایسا نہیں ہے جو باوجود انسانی تہذیب اور شائستگی کی ترقی میں مؤید ہوا اور کسی نص قرآنی یا احادیث نبوی کی صداقت پر شہادت نہ ہو

اگر ذرا غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمائے یورپ زمین جس قدر انسانیت کی تائید کرتے ہیں اور سعی بلیغ اور کوشش ما تشابہی کرتے نظر آتے ہیں ان کا مقصد صرف یہی ہے کہ مذہب اسلام کے قواعد کی صحت اور صداقت پر دلائل و براہین قائم کریں

الغرض جیسا کہ بار بار اوپر ذکر ہو چکا ہے اس امر کا ثبوت کہ اچھی چیز گو موقتاً نگاہوں سے تھوڑی دیر کے لیئے اوجھل ہو جائے مگر اس کا فنا ہو جانا قطعاً ناممکن ہے خود متمدنان یورپ کی بیداری سے ملتا ہے۔ یورپ نے اگرچہ مشرقی اخلاق کی تقلید سے اپنے لیئے اسباب ترقی فراہم کیئے لیکن آخر کار وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔ اور جب اسے اس میں بجز پرخار وادیوں کے کچھ نظر نہ آیا تو پھر اسی گلستان حقیقت کی جس کی تازگی اس کی سرسبزی کا باعث ہوئی تھی یاد پیدا ہوئی۔ چنانچہ وہ بیدار ہو گیا۔ لیکن ہم ابھی تک اسی خواب غفلت میں ہیں اور حقیقت سے دور ہو کر ایسے خارزار میں چکر لگا رہے ہیں جہاں نہ تو ہاتھ پاؤں ہی ہل سکتے ہیں اور نہ ہم کو اپنے اصلی ملجا کی طرف مراجعت کا خیال ہی پیدا ہوتا ہے۔ ہماری حالت کا اندازہ جناب مصنف کی مندرجہ ذیل عبارت سے جس میں انھوں نے اسلامی تمدن کے انحطاط کا ماتم کیا ہے بخوبی ہو سکتا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اخلاف اپنے اسلاف کے ان عظیم الشان کارناموں سے بالکل بے خبر ہیں اور تمام علوم مشرقیہ اور عالمان شرقی جو کسی زمانہ میں تمدن کا سرچشمہ تھے اب کمال عروج دکھا کر علوم مغربیہ کے افق

ہیں غروب ہو گئے ہیں اور عالمان مغرب نے اس حسن ایک خوشنما منظر
عالم کے سامنے پیش کر دیا ہے جس طرح کہ آفتاب نظر فریب اپنی تمام
دن کی چمک دمک دکھا کر شام کو قریب الغروب افق پر ایک خوشگوار
منظر پیش [illegible] کہ تماشائی اسکی فضا میں ایسے محو ہو جاتے ہیں
کہ [illegible] منظر کو فراموش کر دیتے ہیں اور [illegible] ظلمت [illegible]
[illegible] ہو جاتے ہیں [illegible] ظلمت
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کر لیے [illegible] ہیں

[illegible] ہمارا [illegible] ہماری دولت لیٹ لی اور
اب ہماری [illegible] حالت ہو گئی [illegible] کی طرف دست
نگری [illegible] کیے ہوئے ہیں اور کچھ بس نہیں کر سکتے۔ وہی متمدنان عالم
جو کل تک ہمارے دست نگر تھے اور ہمارے خوان نعمت کے چھوٹے سے چھوٹے
ریزے کو بھی اپنا سرمایہ حیات سمجھتے تھے آج ہماری طرف چشم حقارت سے د

بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے، اور ہم ہیں کہ ان کے ہر نقش قدم پر جان و ایمان قربان کرنے کے لیے تیار ہیں ؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

میں نے خود عجیب عجیب انقلابات اپنی زندگی میں دیکھے ہیں۔ پہلے مذہبیات ہماری تعلیم ابتدائی کا جزو اعظم تھیں۔ ہر بچہ کے لیئے دینیات اور قرآن شریف کی تعلیم نہایت ضروری اور لازمی خیال کی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ اس طرح مسدود ہو گیا کہ آج سو میں مشکل سے ایک ایسا ملیگا جس نے دیگر مذہبی کتابوں سے قطع نظر کرکے کلام پاک کی ایک آیت بھی سمجھ کر پڑھی ہو۔ ایسی حالت میں جب کہ ہمارے دل کا آئینہ نقوش اسلامی سے معرّا ہو چکا ہے، مصنوعی شمس ترقی کی ضو فشانیاں ہماری آنکھوں میں جو کچھ چکا چوند پیدا نہ کریں کم ہیں۔ ہمارے پاس اب بجز اس کے کہ "پدرم سلطاں بود" اور کیا باقی رہا۔ اتنا تو ضرور جانتے ہیں کہ مسلمان کبھی دنیا میں کوس "لمن الملکی" بجا چکے ہیں لیکن یہ نہیں خبر کہ وہ ترقیاں اور ان کے ماخذ کیا تھے۔ الغرض ہم فنا ہو گئے اور اپنے ہی ہاتھوں اور اپنے ہی غفلت کے نتیجوں سے۔

اب ہمارا بطور خود ابھرنا قطعی ناممکن ہے۔ ممکن ہے وہی اقوام جو ہم سے ہمارے
اسباب ترقی چھین چکی ہیں کبھی ان کے روحی پہلو پر نظر غائر ڈال کر (جس کی
ابتدا خدا کا شکر ہے ہو چکی ہے) مستفید ہوں اور بہ سلسلۂ قبول اسلام ہمارے
حلقۂ جامعیت کی وسعت کا سبب بنیں۔

الغرض یہ کتاب [illegible] انتہائی جانفشانی [illegible] مطالعہ
[illegible] افکار عالیہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

نظمیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لمن قدّر خیراً وخبالا
والشکر لمن صوّر حسناً وجمالا

تمدّن

انسان جب اس عالم فانی میں اوّل مرتبہ قدم رکھتا ہے اور آنکھ کھولتا ہے تو وہ اس تماشا گاہ اور اس کے بازیگروں کے حرکات و سکنات کا دل دادہ اور اس کے شعبدوں اور کرشموں کا تماشائی ہوتا ہے گویا وہ زبانِ حال سے سوال کرتا ہے کہ میں کہاں آیا اور کیوں آیا؟ اور میری یہ انفرادی ہستی ایسی عظیم الشان دنیا میں کس کام کی انجام دہی کے لئے پیدا کی گئی ہے؟ کچھ حد تک تو یہ مسئلہ بہت پیچیدہ اور لاینحل معلوم ہوتا ہے لیکن تھوڑے ہی زمانہ میں صحیفہ فطرت اس کی عقدہ کشائی کر دیتا ہے اور انسان پر بہت جلد ان امور کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ صحیفہ فطرت کا مطالعہ

یہ سبق دیتا ہے کہ جب تک بھی وہ اس عالم میں ہے اس کو اس عالم کی چیزوں سے
[illegible] کی ضرورت ہے۔ جوں جوں غور و خوض کرتا ہے اس کو محسوس ہوتا ہے کہ
اس کے کل مقصد کی تکمیل کا راستہ بالکل بے خار نہیں ہے بلکہ بہت ہی پُرخار
راستہ ہے بلکہ یہ مسافت [illegible] ہیں۔ جہاں قدم قدم پر بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا
ہے۔ وہ سخت حیران رہ جاتا ہے جبکہ وہ دیکھتا ہے کہ اس جیسی دیگر ہستیاں بھی جو
[illegible] کی ادائیگی کے لیے [illegible] دیتی تک [illegible] ہو کر رہ گئی ہیں لیکن
[illegible] تنگ [illegible] دوسرے کا [illegible] کہ ان میں سے اکثر دوسروں کے
[illegible] بعض دفعہ [illegible] آپ کو نہیں [illegible] کشمکش یا
[illegible] کو معدوم ہوتے [illegible] حقیقت
[illegible] روشنی میں اسکو نظر آتا ہے
کہ [illegible] اور اس کے [illegible] جب تک وہ اس میدان
میں تگ و دو کرتے ہیں ان کو کسی ایسے ضابطہ کا پابند رہنا چاہیے جو ان کی خدمات
کو صحیح راستہ پر رکھنے کا ذمہ دار ہو اور جس کے ماتحت رہ کر ہر ایک اپنے مقاصد کی
تکمیل میں ساعی رہ سکے۔

اگر قدرت کے عطا کردہ حواس سے صحیح کام لے تو اس کو معلوم ہوگا کہ انسان ایک
مقصد کی تکمیل کی غرض سے ایک محدود زمانہ کے لیے اس عالم میں بھیجا گیا ہے۔
اس کے لیے اس کو اپنے زمانہ کی ہستیوں کے طرز عمل پر نظر ڈالنے کی ضرورت

محسوس ہوتی ہے اور وہ ان کے دستور العمل کا جویاں ہوتا ہے جن کے کارناموں سے اس کو یہ سبق ملتا ہے کہ بغیر اس خاص اصول کی پیروی کیے جنہیں اخلاف اسلاف کے لیے بطور یادگار چھوڑ گئے ہیں چارہ نہیں ہے۔

ہم سنتے آئے ہیں کہ افکار انسانی کی یہ تمام گل تراشیاں، انسانی تجلیات کی بلند پروازیاں اور اس دنیا کی تمام بزم آرائیاں صرف ایک اساسی اصول پر کاربند ہونے کا نتیجہ ہیں جسے اصطلاح میں اصول تمدن کہتے ہیں۔ یہ خوش حال اور فارغ البال شہروں کی آبادیاں اور تہذیب جدید کی دلفریب گل کاریاں بھی اس تمدنی زندگی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہیں۔ یہ بحر و بر میں بے خطر سیاحت اور یہ کوہ و جبل کی بے خطر مسافت صرف تمدن کی بدولت آسان ہوگئی ہے۔ اسی تمدن سے اقوام نے ترقی کی منازل عالیہ پر پہنچیں۔ فتح و نصرت ہمرکاب ہوئی اور اقبال سے بہرہ مند ہوئیں اور جب کبھی اس سے منہ موڑا اقبال نے ساتھ چھوڑا۔ تنزل نے منہ دکھایا اور دن بدن گرتا رہا اور بالآخر قعر مذلت میں جا گریں۔ یہی تمدن ہے جس نے معمولی اقوام کو قعر مذلت سے نکال کر اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچایا اور ببانگ دہل سائر کائنات پر ثابت کر دکھایا کہ میرا پیرو دنیا میں ہمیشہ سُرخ رو رہیگا اور مجھ سے برگشتہ دائمی ذلت و مصیبت میں مبتلا کر دیا جائے گا۔

جب اس تمدن کے اسقدر اثرات ہیں تو فطرتاً ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ تمدن کے ان زرین اصول کو معلوم کرے اور حقیقت تمدن سے کماحقہ واقفیت پیدا کرے

لہذا ہم تمدن کے مالہ وماعلیہ سے بحث کرتے ہیں۔

تمدن عربی لفظ ہے جو لفظ مدینہ سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی شہر کے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں تمدن چند اشخاص کے یکجا ہو کر ایک شہر میں رہنے کو کہتے ہیں اور یہ اصطلاح تمام ان قوموں کی اظہار حالت کے لیے مستعمل ہوتی ہے جو بمقابلہ وحشی اور جنگلی لوگوں کے زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہیں۔ مثلاً اقوام یورپ بلحاظ چینیوں اور تاتاریوں کے زیادہ متمدن سمجھی جاتی ہیں۔ امریکہ کے اصلی باشندے اور اہل اسٹریلیا سب سے کم متمدن خیال کئے جاتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آخرالذکر بھی یکجا طور پر شہروں ہی میں آباد ہیں، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جو اول الذکر و آخرالذکر اقوام میں مابہ الامتیاز ہے؟

امثال متذکرہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمدن کی اصطلاح دو معنوں کے لیے مستعمل ہوتی ہے، اول مفہوم تو اس کا یہ ہے کہ اس سے بالعموم انسانی ترقی مراد لیجاتی ہے مثلاً جب ہم کسی قوم کسی شہر و ملک کو زیادہ ترقی یافتہ یا انسانیت میں زیادہ مکمل و سربرآوردہ دیکھتے ہیں یا ہم ان کو زیادہ خوش و خرم، لطیف و نظیف زیرک و دانا اور زیادہ متحد پاتے ہیں تو ان کو متمدن کہتے ہیں اور یہ تمدن کا عام مفہوم ہے۔

اس کے علاوہ ہم تمدن کو اک خاص مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ دراس حالت میں اس سے اک خاص قطعے کی ترقی مراد لیجاتی ہے۔ جیسے کہ خیالی اور وحشی

جنگوں کے مقابلہ میں دولتمند اور ترقی یافتہ اقوام متمدن سمجھی جاتی ہیں اور یہ تمدن کا دوسرا مفہوم ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا تمدن بحیثیت مجموعی کوئی اچھی چیز ہے یا بری؟ یا یہ کہ اس کے محاسن اس کے معائب پر غالب ہیں، یا نہیں: اس کا جواب انسانی تجارب و تواریخ کے مشاہدوں کی بنا پر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ تمدن بذاتِ خود نہ صرف اک بڑی خوبی ہی ہے بلکہ بہت سی خوبیوں کا سبب بھی ہے اور دراصل کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس سے وہ ربط نہ رکھتی ہو، وحشیانہ زندگی کی خواہ کچھ ہی خصوصیات کیوں نہ ہوں لیکن وہ محاسن تمدن کو کبھی نہیں پہونچ سکتیں، وہ صفات جن کو سوسائٹی اپنے جامۂ وحشت کو اتار کر اصول قدیمہ کو اصول جدیدہ سے مبدل کر کے اختیار کرتی ہے انہیں سے تمدن ترکیب پاتا ہے، اک وحشی گروہ میں چند انفرادی ہستیاں یا چند اشخاص پراگندہ صورت میں آباد ہوتے ہیں اور غیر متمدن کہلائے جاتے ہیں لیکن ان کے مقابل میں اک گنجان آبادی جو مقررہ مسکنوں میں بود و باش رکھتی ہے اور ایک کثیر تعداد جماعت کے ساتھ قصبات اور شہروں میں آباد ہے اور متمدن کہلائی جاتی ہے۔ وحشیانہ زندگی میں تجارت زراعت اور صنعت و حرفت یا تو سرے سے ہوتے ہی نہیں اگر برائے نام کہیں پائے بھی جاتے ہیں تو وہ اسقدر بے اصول ہوتے ہیں کہ ان کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے لیکن اس کے مقابل میں ایک متمدن ملک زراعت تجارت اور صنعت و حرفت سے مالامال ہوتا ہے، وہاں کا ہر اک مشغلہ کسی نہ کسی اصول کے

ماتحت ہوتا ہے اور وہاں کا ہر کام ترقی کی شاہراہ پر انجام پاتا ہے۔ وحشی لوگوں میں ہر شخص انفرادی حیثیت سے صرف اپنی ذات کا فائدہ مدِنظر اور ملحوظ خاطر رکھکر محنت و مشقت کرتا ہے اور غیر متمدن کہلائے جانے کا مستحق ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب ہم دوسری طرف بنی آدم کی ایک جماعت کثیرہ کو کسی ایک غرض مشترک کے واسطے مصروف کار پاتے اور باہمی معاشرت میں ایک دوسرے سے متحد خوش و خرم شادان و فرحاں دیکھتے ہیں تو ان کو متمدن کہتے ہیں۔ وحشیانہ زندگی میں کسی قانون نظم و نسق اور ادارہ کا تو وجود ہی نہیں ہوتا یا اگر کہیں پایا بھی جاتا ہے تو صرف برائے نام اور وہ صرف اس ضرورت سے کہ منفرد اشخاص ایک دوسرے کی ایذا رسانی اور آزار رسانی سے محفوظ رہیں۔ نہ تو سوسائٹی کی منضبطہ و متفقہ قوت باقاعدہ طور پر صرف ہوتی ہے اور نہ اتحاد اور جماعت کے فوائد سے کوئی واقف ہوتا ہے بلکہ ہر شخص واحد اپنی قوت بازو یا ذاتی چالاکی پر بھروسہ رکھتا ہے، برخلاف اس کے جس جماعت میں سوسائٹی کا نظم و نسق اس قدر کامل ہو جاتا ہے کہ اس جماعت کی متفقہ قوت [illegible] محفوظ [illegible] قائم رہے تو اس سوسائٹی [illegible] کہتے ہیں۔

[illegible] انسان کو متمدن کہتے ہیں [illegible] اپنی [illegible] [illegible] [illegible]

خاطر رہتا ہے خواہ وہ اس کی عمر میں کسی وقت حاصل ہو۔ اب تمام ایجادات و انتظامات اور انکشافات جو زندگی کے ہر شعبہ میں کیئے جاتے ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو وحشیانہ حالت سے نکالا اور بالا سے بالاتر اور بہتر بدل ترقی و تمدن پر پہنچا دیا اور یہ پہلی قسم کی ترقی ہے لیکن دوسری قسم یا بالفاظ دیگر ترقی کی انتہائی منزل یہ ہے کہ انسان میں جو اوصاف موجود ہوں وہ سب حالت اعتدال پر آجائیں اور انسان اس قدر تزکیہ نفس کرے کہ اس کی روحانی صفات مکمل طور پر متصف ہو جائے یہی وہ ترقی ہے جو اصل ترقی ہے اور یہی ترقی یافتہ انسان اصل معنوں میں متمدن کہلائے جانے کا مستحق ہے لیکن بدقسمتی سے مادی ترقی غالب ہے صرف اس عالم کو ان قسم میں انسانی ترقی کا اس قدر ترقی کر گئے کہ عالم اور مادی اعتبار سے اس کا خاتمہ ہو جاتا اس نے ترقیات روحانی کو جو اصل ترقی ہے، بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔

انسان کا نصب العین اپنی ترقی کو شش کرنا اور اس ترقی کے اعلیٰ پر پہنچنا ہے انسان کو قدرت سے بہت کچھ عطا فرمایا گیا ہے لیکن ان صفات فطرت میں تصرفات کرنا اور غور و خوض کر کے اپنے لیے سامان ترقی فراہم کرنا تو انسان کا کام ہے لہذا انسان کی ذہانت اور ذکاوت سبب ہے اور تمدن اس کا نتیجہ۔ انسان کی سعی بلیغ اور کوشش اتنا ہی علت ہے۔ اور تمدن اس کا معلول۔ تمدن کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ قوت و اقتدار منفرد اشخاص یا چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر جمہور کے ہاتھوں میں پہنچ جاتا ہے [illegible] جماعت کا زور تھا

اور اشخاص کا زور گھٹتا رہے۔ دوسرے وہ متفرق افراد کا ایک مجموعہ تیار کرے اور اس مجموعہ کو متحد کر کے اسے با اثر بنائے۔

اگر ایک وحشی شخص کے حالات زندگی پر نظر کیجائے۔ تو معلوم ہو گا کہ اس کو جسمانی قوت بھی حاصل ہوتی ہے اس میں دلیری اور جوانمردی بھی پائی جاتی ہے ہمت و جرات بھی موجود ہوتی ہے۔ لیکن باوجود ان تمام محاسن کے اس میں کوئی ایسی نمایاں کمی اور خامی پائی جاتی ہے جس کے سبب سے کل وحشی جرگے غریب و کمزور ہوتے ہیں وہ کمی اور خامی کیا ہے؟ وہ ہی کمی اور خامی ہے جس کے سبب سے شیر بھیڑیئے باوجود قدرت، قوت دلیری و ہمت انسان ضعیف البنیان کمزور و ناتواں پر غالب نہیں آسکتے۔ یعنی ان میں متحد ہو جانے کی قابلیت کا نہ ہونا ایک ایسی کمی ہے جو ان وحشی جرگوں کو افلاس میں مبتلا رکھتی ہے اور ان کی آیندہ ترقیات میں سد راہ ہوتی ہے۔

یہ صرف متمدن افراد کا کام ہے کہ وہ متحد ہو سکتے ہیں ایک وحشی غیر متمدن نہ یہ کر سکتا ہے کہ کسی غرض مشترک کے واسطے وہ اپنے نفس پر سختی برداشت کرے اور حفظ نفس کو چھوڑ دے نہ اس کے معاشرتی جذبات کبھی عارضی طور سے بھی اس کی نفسانی خواہشات پر غالب آسکتے ہیں نہ اس کے طبعی رجحانات اس کی انجام بینی کی وجہ سے کم و بیش ہو سکتے ہیں۔ عاقبت اندیشی وہ نہیں جانتا ذاتی بہبودی کے فوائد سے وہ بے خبر ہوتا ہے۔ لہذا ہر وہ بات جو دوسرے کی رضا جوئی کے لیے ذرد بھی

ہوتی ہے اس کے دل سے دور رہتی ہے بجنسہ یہی حالت جو افراد کی ہوتی ہے اس جماعت کی بھی ہوتی ہے جس سے وہ تعلق رکھتے ہیں چونکہ جماعت نام ہے مجموعہ افراد کا اس لیے جسقدر کوئی گروہ وحشت سے قریب تر ہوتا ہے اسی قدر اشتراک عمل سے بعید تر ہوتا ہے۔

واقعات گذشتہ وحال پر اک سرسری نظر یہ ثابت کر دیتی ہے کہ غیر متمدن اقوام کبھی متمدن اقوام سے قدرت جنگ وجدل میں کامیاب نہیں ہوئیں انھوں نے ہمیشہ متمدن اقوام کے مقابلہ میں شکستیں کھائیں ہزیمتیں اٹھائیں اور بالآخر متمدن اقوام نے فتح ونصرت کا جھنڈا بند کیا اور بڑی بڑی سلطنتوں پر مدبرانہ حکومت کی اقوام عالم کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب دو ملکوں یا دو قوموں میں باہم مقابلہ یا مجادلہ ہوتا ہے تو فتح وکامیابی کا سہرا اسی کے سر رہتا ہے جو بلحاظ تمدن فائق ہوتا ہے۔ مسائل بین الاقوام تعداد افراد سے طے نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ ان افراد کی ذاتی قابلیت ان کے متحد ہو جانے اور غرض مشترکہ پر ذاتی خواہشات کو فدا کر دینے کی قابلیت اور صلاحیت سے تصفیہ پاتے ہیں۔ یہ اک ایسا اصول ہے جس کا ہر شخص قائل ہے۔

ممالک غیر کو چھوڑ کر خود ہندوستان ہی کے صفحات تاریخ اس پر شاہد ہیں یہاں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا تھوڑے ہی سے غور کے بعد اس اصول کو ہمہ صفت اس پر منطبق ہوتا ہوا پا سکتا ہے وہ برا العین مشاہدہ کر سکتا ہے کہ ہندوستان

کی سنان سلطنت جو ہمیشہ سے اقوام غیر کے ہاتھوں میں رہی ہے اس کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دیسی ریاستیں جو اپنی مردانگی شجاعت اور دلیری و جوانمردی میں زبان زد روزگار رہی ہیں جہاں کا اک اک سورما بڑے بڑے قدآور پہلوانوں کو تنہا زیر کر دیتا ہے اور اک اک شخص دس دس کے لیے کافی ہوتا ہے جہاں غیرت و محبت اس درجہ تھی کہ مفتون ہونے سے جل کر فنا ہو جانا بہتر خیال کیا جاتا تھا وہاں جب اس سے زیادہ متمدن اور متحد ہونے والی قوم سے مقابلہ ہوا تو بالآخر یہ سب خوبیاں رکھی رہ گئیں اور آخر کار اس نے سب کو یکے بعد دیگرے سرنگوں کر دیا اور سب کی ہستی اس طرح فنا ہو گئی کہ اسلاف اخلاف کے لیے محض افسانہ ہو کر رہ گئے۔

یہاں تک تمدن کے خواص و نتائج سے بحث کر کے ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تاریخ تمدن کی بابت علمائے زمانہ کیا رائے رکھتے ہیں۔ دنیا میں انسان کی تاریخ لکھنے والے محققین ہیں جہاں اس کی ابتدائی آفرینش کے مسئلہ پر بحث و تدقیق کی ہے وہاں یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے کہ پیدائش انسان کی صورت اور ترکیب سے ہوئی یعنی کون سے قوائے نفس و مادی سے انسان مرکب ہو کر تب ہو کر دنیا میں آیا۔ انسانی جماعتیں جو اب متمدن نظر آتی ہیں ان کے تمدن کی تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے اور یہ وحشی اقوام جو آج غیر مہذب اور غیر متمدن مانی جاتی ہیں کیا ہمیشہ سے ایسی ہی ہیں یا کبھی اس سے بہتر حالت میں تھیں اور اب گردش زمانہ سے ایسی غیر متمدن ہو گئی ہیں یا

یا یہ ہنوز اپنی فطرت پر ہیں؟ بالفاظ دیگر، نہ تمدن وتہذیب مقدم ہو پایا، نہ وحشت و جہالت؟
اس مسئلہ پر دو فریق جداگانہ رائے رکھتے ہیں۔

انسان کی ابتدائے آفرینش کے بارے میں ق[illegible] کی رائے کو نظر انداز کر کے
انیسویں صدی کے یورپ میں ڈاروان نے جو نظریہ قائم کیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ
انسان ایک ترقی یافتہ جانور ہے۔ اس نظریہ کو نظریہ ا[illegible] یا ایولیوشن [illegible]
ڈاروِن اور ہکسلے ا[illegible] کے قائل [illegible] اگرچہ ہنوز اس
کے دلائل تکمیل کو نہیں پہنچے [illegible] و سلسلہ استدلال [illegible] میں بہت [illegible] [illegible] سال
کی موجودات کے لحاظ سے [illegible] [illegible] ہے لیکن [illegible] کا یہ [illegible]
ہے کہ جس قدر سائنس [illegible] ترقی ہوگی [illegible] انسانی [illegible] گا [illegible] وہ کڑیاں
بھی [illegible] مزید کے دستیاب ہو [illegible] [illegible] ہو جائیں گی۔ [illegible]
جس قدر دلائل پیش کیے گئے ہیں ان کی آب وتاب نے اس نظریہ کی آنکھیں خیرہ
کر دی ہیں اور عام طور پر یہی رائے مقبول ہو رہی ہے اور نہ صرف بدایت انسان
بلکہ تمدن کے نشو و نما کے بارے میں بھی ترقی اور روز افزوں ترقی کا ہر شخص
قائل ہے۔

دوسرا [illegible] یہ ہے کہ انسان کے تمدن کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس بارے میں
بھی دو مذہب [illegible] [illegible] [illegible] ہیں۔ ایک گروہ [illegible] کا [illegible] [illegible]
[illegible]

کہ مرورِ ایام سے انسان نے بتدریج مدارج تمدن طے کیے ہیں اور اسلاف سے اخلاف زیادہ متمدن ہوتے چلے آئے ہیں۔ لیکن اک دوسرا گروہ محققین کا یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان اپنی بالکل ابتدائی حالت میں ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہے اگرچہ اس کو علوم حکمیہ اور علوم نقلیہ کا علم نہ ہو لیکن اس میں قوائے ذہنی اور عقلی کسی طرح بھی کمتر درجہ کے نہ تھے اس فریق کے اک بڑے حامی

ڈیوک آف ارگائل کی رائے یہ ہے کہ "انسان اپنے اعلیٰ درجہ تمدن اور شائستگی کی حالت میں بھی نہایت پستی اور تنزل میں پہنچنے کی استعداد رکھتا ہے۔ اس کا علم زائل ہو سکتا ہے اور اس کا مذہب چھوٹ سکتا ہے" بہرحال محققین آخرالذکر اس بات کے حامی ہیں کہ وحشی جرگوں میں از خود ترقی کی جانب مائل ہونے کی کوئی خاص قوت نہیں ہوتی اور نہ اس امر کا کوئی خاص بین ثبوت ملتا ہے کہ انہوں نے کبھی از خود ترقی کی ہو بلکہ بعض اقوام کی یکساں حالت پر غور کرتے ہوئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں ترقی کا مادّہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ جہاں وحشی اقوام آباد ہیں وہاں آثار قدیمہ کے محققین نے بیحد کدوکاوش کے باوجود بھی کوئی ثبوت گذشتہ تمدن کا نہیں پایا یعنی طبقات زمین سے کوئی علامت تمدن قدیم کی نمایاں نہیں ہوئی گویا اس گروہ کے نزدیک زمانہ ترقی کی جانب مائل نہیں ہے۔

یہ مسئلہ اکثر معرض بحث میں رہا ہے اور ہر دو فریق اپنے دلائل سے ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر انسانی حالت کو بنظر غور

وامعان مطالعہ کیا جائے تو اس امر کا انکشاف ہوجاتا ہے کہ اک کمزور مخلوق برہنہ جسم نازک بدن اور ضعیف الاعضا جس کی حفاظت جسمانی کے لیے نہ کوئی ہتیار ہے نہ کوئی یارومددگار اس زندگی کے جدال وقتال میں مبتلا کی گئی ہے وہ رفیع الشان کوہستان کو نظر اُٹھا کر دیکھتی ہے اور ان کی عظمت اس کے دل میں وحشت پیدا کردیتی ہے وہ سنسان بیابانوں عمیق غاروں اور وسیع بروبحر کا مشاہدہ کرتی ہے شیروں اور ہیبتناک درندوں کی آوازیں سنتی ہے اور اس پر سخت ہیبت طاری ہوجاتی ہے، فلک نیلگوں، روشن ستارے، آفتاب و ماہتاب اس کی آنکھوں میں خیرگی پیدا کردیتے ہیں اور یہ سب چیزیں اس کو محوِ حیرت بنا دینے کے لیے کافی ہیں علاوہ اس کے بھوک پیاس گرمی سردی۔ ذریدائش سے دشمن ازلی اس کے ساتھ ہیں یہ حالت اس وقت تھی جب نوع انسان نے کتم عدم سے اس عالم رنگ و بو میں اپنا پہلا قدم رکھا۔ لیکن اس کمزور مخلوق نے تمام حوادث طبعی کا مقابلہ کیا اور ان کو مغلوب ومقہور کرکے اپنا اس قدر مسخر کرلیا کہ وہ سنگلاخ پہاڑوں میں بآسانی سُرنگ لگالیتی ہے۔ بروبحر میں برسوں کا راستہ دنوں میں طے کرلیتی ہے، آفتاب ماہتاب سب اس کے ادنیٰ خادم ہیں تو کیا اس علمی تدبر اور تفکر کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ انسان صرف ایک مادی جسم کا نام ہے۔ اور ہمیشہ سے یکساں حالت میں ہے؟ بلکہ اس مادی انسانی جسم کے غلاف میں ایک ایسا جوہر مخفی ہے جس کی وجہ سے انسان کو دیگر حیوانات سے امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے اور وہ

ما بہ الامتیاز شے نہ تو نطق ہے جیسا کہ ارسطو کا قول ہے اور نہ محض دینداری جیسا کہ ایک فرانسیسی فلسفی کا خیال ہے بلکہ دراصل وہ عقلی اور اخلاقی ترقی کرنے کی بیش بہا استعداد اور قابلیت ہے جس کی کوئی حد و غایت نہیں مقرر کی جا سکتی۔ حیوان ایک خاص اور مقررہ وقت تک ترقی کر سکتا ہے۔ لیکن انسان کے لیے کوئی حد نہیں ہے اس دعوے کی دلیل میں دو مشہور مغربی فلسفروں کی رائیں قابل لحاظ ہیں، ایک فرانسیسی فلسفر لاروس (Larousse) نے دائرۃ المعارف میں انسانی ترقی کی نسبت لکھا ہے کہ ترقی انسانی کے لیے کوئی خاص حد قرار دینا ایک ایسی دقت ہے جو معیوب خیال کی جا سکتی ہے" رینان (Renan) اپنی کتاب تاریخ الادیان میں لکھتا ہے کہ میں نے انسان کی حالت کو بنظر غور مطالعہ کیا ہے بعض اوقات انسان اپنی تمام قوتوں کو جمع کر کے ایک ایسی سعی بلیغ کرتا ہے کہ اس کو وہ سبب معلوم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کو غیر محدود اختیار اور نامتناہی اقتدار حاصل ہے، نیز یہ کہ وہ اس تمام مادی عالم پر مسلط ہو جائے" اس سے یہ امر بالکل صحیح ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے جوہر کی برتری اور گراں مایگی کے لحاظ سے ان تمام مادی چیزوں میں ممتاز ہے جن کو قدرت نے مجرد القویٰ پیدا کیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کبھی یکساں حالت میں نہیں رہ سکتا بلکہ یوماً فیوماً ترقی کے میدان طے کرتا چلا جاتا ہے، لیکن جس طرح انسان میں فضائل و کمالات کی طرف غیر متناہی درجات تک ترقی کرنے کی قابلیت ودیعت کی گئی

ہے اسی طرح رذائل کے ناحیہ وہ درجات کی طرف تنزل کرنے کی استعداد بھی اس میں رکھی گئی ہے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنٰہ اسفل سافلین کے یہی معنی ہیں انسان نہ تو کوئی آسمانی فرشتہ ہے نہ وہ حیوان لایعقل ہے کہ زندگی کے تاثرات اور اس کے آلام کا احساس اس کے دل میں نہ ہو یا ہو تو کمزور ہو بلکہ وہ ان دونوں درجوں کے درمیان میں ہے، اگر وہ اپنے نفس کا کما حقہ احترام کرے تو فرشتوں سے بھی اعلیٰ ہو سکتا ہے اگر نفسانی فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کرنے لگے اور بشریت کے تسلط کا مطیع ہو جائے تو تنزل کے عمیق ترین قعر میں غرق ہو جاتا ہے ؎

آدمی زادہ طرفہ معجونیست — از فرشتہ سرشتہ وز حیواں
گر کند میل ایں بود بہ ازیں — ور کند میل آں شود بتر ازاں

تاریخ تمدن پر نظر ڈالتے ہوئے تمدن انسانی کی تقسیم چار بڑے بڑے عہدوں پر ہو سکتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان نے کس طرح مدارج ترقی طے کیے پہلا وہ دور ہے جس میں انسان دیگر حیوانات کے ساتھ خلط ملط رکھتا تھا اور انھیں سے گھلا ملا رہتا تھا اس کے گرد و پیش نہایت عظیم الجثہ جانور رہتے تھے جن کا اب صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ بعض مقامات پر اسفل ترین طبقات الارض میں ان کے ڈھانچے برآمد ہوتے ہیں اور وہ بھی شاذ و نادر۔ اس وقت انسان کی حالت محض چارپایوں اور درندوں کی سی تھی اور غالباً اس کی زندگی اور ایک جانور کی زندگی

کوئی فرق نہ تھا اس کے کھانے کے واسطے جنگلی میوے اور کمزور جانور موجود تھے اور اس کی بودوباش کے لیے پہاڑوں کے غار اور درختوں کی سایہ دار شاخیں کافی تھیں۔

دور ثانی وہ ہوا جس میں اس نے اور دیگر پتھروں کے سڈول ہتھیار اور اوزار بنانا اور ان سے کام نکالنا شروع کیا یہ عہد حجریہ (Stoneage) کہلاتا ہے اس وقت اس کے کل کام یا تو خود اس کی قوت بازو سے نکلتے تھے یا پتھروں کے ذریعہ سے پتھر ہی اس کے آلات حرب وضرب تھے۔ پتھر ہی اس کے ظروف اکل وشرب تھے اور پتھروں ہی میں وہ رہتا تھا یہ عہد تمام اکناف عالم میں مشترک ہے۔

دور ثالث وہ ہوا جس میں برنجی اور مسی آلات اور اوزار بنائے گئے اس عہد مس وبرنج یا (Copperage) کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس عہد کا پتہ زیادہ تر ایشیا اور یورپ کی قدیم قوموں میں ملتا ہے اور انھیں کے یہاں یہ عہد صدیوں تک قائم رہا لیکن پالینشیا جنوبی افریقہ اور وسطی امریکہ میں عہد حجریہ کے بعد یہ عہد نہیں ہوا بلکہ دور چہارم جس کو آہنی عہد یا (Ironage) کہتے ہیں شروع ہو گیا۔ اس عہد میں آہنی آلات تمام سابقہ آلات وظروف پر سبقت لے گئے لیکن اس عہد میں بھی آلات موجود رہے مگر فوقیت لوہے کو رہی اسی طرح دور چہارم اس سے زیادہ ترقی یافتہ انسانوں میں پایا گیا اور سلسلہ ترقی بڑھتا گیا۔

لیکن ان چار عہدوں کے علاوہ ایک اور صورت سے بھی ترقی کے مدارج بیان کیے جاتے ہیں کہ پہلا وہ دور تھا جب انسان جنگل کا ایک شکاری تھا وہ مختلف درندوں اور پرندوں کو مار کر اپنی قوت لایموت مہیا کرتا تھا۔ پھر دوسرے دور میں اس نے ترقی کر کے ماہی گیری شروع کی۔ دریا سے مچھلیاں مارنے کے واسطے اس سے جال وغیرہ تیار کیے۔ پھر میوہ برداری پر اس نے اپنی توجہ مبذول کی اور فواکہات کے مزے سے اس کے کام و دہن آشنا ہوئے۔ اب اس حالت سے درختوں کی مختلف فصلوں کا علم ہوا اور تجربہ نے اس پر وہ نکات درموز منکشف کر دیئے جن سے اس نے درختوں کا بونا اور کاشت کرنا سیکھا اس زراعت میں اس کو اس قدر فراغت نصیب ہوئی کہ مختلف فنون وحرفت و مشقت میں اس نے اپنا قدم رکھا اور سوشل خیالات اور پولیٹیکل معاملات کا چرچا شروع ہو گیا۔ اس سلسلہ میں شخصی انتقام کی جگہ یہ خیال پیدا ہوا کہ ہر جرم اس لیے سزا کے قابل ہے کہ اس سے سوسائٹی کے نظام میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح اک قبیلہ کی حکومت ایک شخص واحد کے ہاتھ سے نکل کر متعدد گھرانوں اور خاندانوں کا ایک مجموعہ بنا اور پھر دائرہ تمدن ترقی کرتے کرتے اس قدر بڑھا کہ ملکی اور قوموں کی حکومت کے لیے ریاست و بادشاہت معرض وجود میں آئی۔

تمدن اور مذہب۔ اگر تواریخ عالم کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بنی آدم کا تمدن متعدد حیثیتوں سے ان کے مذہب سے وابستہ ہے اقوام کے عروج و زوال

میں ان کا مذہب بہت کچھ دخیل ثابت ہوا ہے یہاں تک کہ زمانہ قدیم سے اب تک یہ امر زیر بحث ہے کہ ان میں سے کون سبب ہے اور کون مسبب؟ زمانہ گذشتہ کے محققین اور نیز اہل مذہب اس رائے پر پہنچے ہیں کہ تمدن سبب ہے اور مذہب اس کا نتیجہ۔ ان کی تالیفات و تصنیفات مذاہب کی بہت طعن و تشنیع سے مملو نظر آتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی آنکھیں ان کی روشنی سے اس قدر خیرہ ہو گئی ہیں کہ مذہب ان کے نزدیک دراصل کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ وہ مذاہب کو صفحہ ہستی سے محو ہو جانے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر ہم چند یورپین فلاسفروں کی رائے ان کی مشہور و معروف تصانیف سے اخذ کر کے اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

موسیو بنجمن کونستان (Benjamin Constan) نے

اپنی مشہور کتاب میں جس کا نام مذہب اور اس کا سرچشمہ اور اس کی شکلیں اور اس کی ترقی ہے ان امراض سے بحث کی ہے جنہوں نے باطل اعتقادات کی مدد سے انسانی گروہوں کے جسم کو کھا ڈالا ہے۔ اور اس کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کا علاج شخصی آزادی، ضمیر یا کانشینس کی آزادی، اعتقاد کی آزادی اور تمام ضروری آزادیوں کے بغیر ناممکن ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ اس طریقہ سے مذاہب اپنے ہر قسم کے زنگ اور میل سے پاک و صاف ہو جائیں گے مگر ہم کو خیال نہیں کہ ایسا ہو سکے کیونکہ مذہبی اصول و قواعد میں سے کوئی قاعدہ بھی ایسا نہیں ہے جس کو زنگ نہ کھا چکا ہو اور چونکہ یہ اصول و قواعد منافی علم ہیں اس لیے یہ بالکل واضح ہے کہ تمام مذاہب

اور دین صرف نفس ہستی سے نیست و نابود ہوجائیں گے " یہاں ایک مشہور فلسفی نے اپنی رائے کے مطابق تمام مذاہب کے لیے بغیر کسی استثنا کے یہ حتم پیشین گوئی کردیا ہے کہ ان کا زوال لازمی اور ضروری ہے آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ "ہر ایک قاعدہ خواہ وہ موجودہ حالت میں کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو لیکن ضروری ہے کہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہوگی جو آیندہ زمانہ میں ترقی کے سد راہ ہوگی چونکہ وہ قاعدہ مرور زمانہ کے بعد ایک سخت شکل اختیار کرلے گا جس کا اتباع عقل انسانی کے لیے اپنے انکشافات میں جن کی روزبروز ترقی ہوتی جاتی ہے ، ناممکن ہوگا ۔ اور جب ایسا ہوگا تو اس نتیجہ قاعدہ کا مذہبی اثر دلوں سے مفقود ہوجائیگا اور ایسے اصول و قواعد کی تلاش ہوگی جو ان جدید ترقیات اور انکشافات کے منافی نہیں "

علامہ رینش - مذہب کی نسبت اک موقع پر لکھتا ہے کہ "مذہبی فضیلت اور بالخصوص اعلیٰ درجہ کی فضیلت جو اولیاء اللہ کے ساتھ مختص ہے یہ ہے کہ تمام سیاسی اور تمدنی زندگی کو خیرباد کہو اور تمام دنیوی کاروبار کو مثل ایک لغو اور باطل چیز کے ترک کردو ، تاکہ تمہارے لیے یہ امر ممکن ہو کہ تم رنج و غم اور شکستہ دلی کے ساتھ جنت کے انتظار میں سو کھتے ہو اور اپنی تمام خصلتوں اور خواہشوں کو قتل کر ڈالو اور اپنے نفس کو مٹا دو "

غرض یہ ہی کہ فلاسفہ یورپ اور ماہرین علوم مغربی یہ رائے رکھتے ہیں کہ انسان

کی ترقی کا انحصار علم کی ترقی اور اس کے نشو و نما پر ہے اور علم کی ترقی اس پر موقوف ہے کہ عقل کو اس کے قیود سے آزاد کر دیا جائے اور علمی مباحث کے لیے کسی قسم کی کوئی مزاحمت و روک ٹوک باقی نہ رہے تاکہ اس مزاحمت سے وہ بدترین نتائج پیدا نہ ہوں جو قدیم زمانوں میں علمی اور مذہبی گروہوں کے باہمی جدال و قتال سے پیدا ہوتے تھے الغرض نقطۂ نظر یہ ہے کہ عقل و علم کی آزادی پر انسان کی مادی اور ادبی نجات و فلاح منحصر ہے۔

علامہ ڈارون ([illegible]) ایک مقام پر اس بات پر قمطراز ہیں کہ جب وہ کہتے ہیں کہ مذہب یہ ہے کہ ہم معتقدین پیروؤں کو اتفاق دیکھیں تو اہل مذہب حقیقت میں کرتے کیا ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ انسانی عقل کے قطع کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو حلال و حرام، نیک و بد، خیر و شر کے درمیان تمیز کرنے کا دعویٰ کرتی ہے اور جب وہ نفس و طبیعت کو مشاہدۂ قدرت میں بند کر دیتے ہیں کہ آیات اور خوارق عادات ان کو بالکل معمولی اور عادی امور معلوم ہونے لگتے ہیں اور عقل سفید و سیاہ اور بدی و نیکی سمجھنے لگتی ہے تو مذہب کہتا ہے کہ اطاعت کرو۔ کس کی اطاعت کریں؟ آیا عقل کی اطاعت کریں؟ اپنے تخیل ذہنی کی؟ ذاتی احساسات کی؟ حقیقی قوانین فطرت کی جو انسان کے سینے میں مخفی ہیں؟ ہرگز نہیں مگر تم اندھے بن کر اس کی اطاعت کرو۔ جو خدا کے نام سے حکم دیتا ہے۔ گو وہ بادشاہ کے قتل کرنے یا باپ کے مار ڈالنے کا بھی حکم دے یا قتل عام برپا کرنے پر آمادہ کرے کیونکہ تجھ میں

نہ روح ہے نہ ضمیر بلکہ تو خدا میں فنا ہو گیا ہے "

وہ اعتقادات و خیالات ہیں جن پر ہمارے عقلائے یورپ مذہب کے بارے میں فخر کرتے ہیں اور تمام ترقیات کو اپنے ذاتی عقول پر منحصر کرتے ہیں لیکن، وہ اس زرین اصول سے بے خبر ہیں کہ الدین ھو العقل و لا دین من لا عقل لہ اس میں شک نہیں کہ عقل نوع انسانی کی بہترین خصوصیت ہے اور خدائے تعالیٰ کی افضل ترین نعمت جو انسان کو عطا کی گئی ہے جس مقصد کے لیے یہ عظیم الشان نعمت عطا ہوئی ہے اگر اس مقصد میں استعمال کی جائے اور اس کی صحت و اعتدال قائم رکھنے کے لیے توجہ مبذول کی جائے تو اس سے حیرت انگیز نتائج ظاہر ہوتے ہیں چنانچہ اس عقل کی بنا پر جہاں عقلائے یورپ مذہب کے اس قدر مخالف ہیں وہاں وہ اس امر کا بھی اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکے کہ مذہبی احساس نفس انسانی میں ایک ایسا فطری اور خلقی احساس ہے جیسا کہ انسان کو غذا اور ہوا کی ضرورت کا احساس ہے۔ چنانچہ علامہ شیلر ([illegible]) ایک جرمن فلاسفر اپنی کتاب تاریخ الاعتقاد میں لکھتا ہے کہ مذہب مثل اس احساس کے ایک وہ نتیجہ ہے ہمیشہ رہنے والی چیز ہے مگر مذہبی علوم مثل دیگر علوم و فنون کے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کرتے جاتے ہیں جس قدر کہ انسانی عقل ترقی کرتی ہے اور انسانی تعلق ہمیشہ حقوق اور عدم قوانین کے درمیان موجود رہتا ہے۔

خود لارڈ روس ہی مذہبی نظامات کی نسبت طعن کرنے کے لیے لکھتا ہے کہ "جو چیز انسان کو اپنے فرائض کی انجام دہی پر آمادہ کرتی ہے وہ مذہب نہیں ہے

بلکہ ان تمام چیزوں سے اور قوت طبیعت اور نیز وہ احساسات ہیں جن کی نشو و نما سوسائٹی اور ان افراد کے درمیان ہوتی ہے۔ بہ قدر ان معلومات اور تمدن کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا اسی قدر یہ عام خیال بھی ایک موجود شے سے اونچا ہوتا جاتا ہے اگر مذہب کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایسے عمدہ خیالات کا مجموعہ ہے جو تمام انسانی افراد کو ایک ایسی سوسائٹی میں موجود کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کے افراد دوامی قوانین سے متمتع اور روشن خیال ہوں۔ تو بیشک اس صورت میں یہ قول صحیح ہوگا کہ مذہب نوع انسانی کے لئے ایک ضروری اور لابدی چیز ہے۔

یہ امر کہ عقل انسانی خواہ ترقی کے کسی اعلیٰ ترین درجہ پر کیوں نہ پہنچ جائے مگر وہ بغیر مذہب کے زندہ نہیں رہ سکتی اس کی واضح دلیل ہے کہ علمائے یورپ نے بھی باوجود مخالفت مذہب بالآخر مجبور ہو کر ایک مذہب تصنیف کیا جس کا نام مذہب طبعی رکھا۔ اس کے علاوہ ہم روزانہ برأی العین مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض ایسے لوگ موجود ہیں جو ہر حالت سے متمتع ہیں دولت و ثروت میں قارون ثانی ہیں۔ اور انہوں نے مختلف علوم و فنون کی زبردست تعلیم حاصل کی ہے لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ہر وقت ان کو ایک قسم کی اندرونی گھبراہٹ اور دلی بے اطمینانی اور تحیر سخت محسوس ہوتی ہے جو ان کی تمام راحتوں اور لذتوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی ہے ان کو اپنے دل میں ایک ایسا تکدر و ملال محسوس ہوتا ہے جس کا کوئی سبب ان کو معلوم نہیں ہوتا اور جو صرف اسی وقت زائل ہو جاتا ہے، جب مذہب

کی شراب طہور کا ایک تسکین بخش گلاس ان کو مل جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اس پر اسقدر فریفتہ اور دلدادہ ہو جاتے ہیں کہ بعض مرتبہ تمام دنیوی جاہ و جلال اس کے سامنے ان کو ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے چنانچہ ڈاکٹر گل امریکہ کے مشہور پروفیسر جو حال ہی میں ہندوستان بغرض سیاحت تشریف لائے تھے اپنے لیکچر میں فرماتے ہیں کہ امریکہ میں باوجود اس قدر تمول اب جس چیز کی ہر دل میں تشنگی ہے وہ اخلاق کیرکٹر یا مذہب ہے" ان کی رائے ہے کہ دنیا میں کوئی شخص خواہ جسمانی دماغی یا مالی کتنی ہی ترقیاں کیوں نہ کرلے بغیر کیرکٹر یا مذہب کے ہرگز قابل قدر و منزلت نہیں ہوسکتا۔ اور ایک لامذہب سوسائٹی کے لیے سم قاتل ہوتا ہے جس سے تمدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

مذہبی ضروریات کا اندازہ کرتے ہوئے اب ہم موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یعنی انسان کے مدنی الطبع ہونے سے بحث کرتے ہیں یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ انسان فطرۃً مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی انسانوں کی ایک جماعت کثیر کا راحت کیساتھ عمر طبعی تک پہونچنے اور آیندہ نسلوں کو راحت و آرام سے عمر طبعی تک پہونچانے کی غرض سے باہم مل کر بود و باش اختیار کرنا انسانی فطرت ہے۔

جب راحت کے ساتھ عمر طبعی تک پہونچنے اور آیندہ نسلوں کو عمر طبعی تک براحت و آسایش پہونچانے کے لیے ایک کثیر جماعت باہم مل کر رہتی ہے تب اس میں تعامل اور تعاون شروع ہوتا ہے یعنی تمام وہ امور جو شخصی اہلی اور نوعی زیست کے باقی

رہنے اور بہتر ہونے کے لیئے ضروری ہیں ان کو وہ بہت سے اشخاص آپس میں علی قدر مراتب بانٹ لیتے ہیں ہر شخص کے تمام ان کاموں میں سے جو وہ روزانہ انجام دیتا ہے بعض ایسے ہوتے ہیں جو وہ صرف اپنی ذات کے لیے کرتا ہے اور زیادہ وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے فائدہ کے لیے ہوتے ہیں۔

تصاحب و تعاون سے جو مطلق آزادی کسی بزیرے کے ایک تنہا باشندے کو ہو سکتی ہے اس میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا ہے تنہائی میں وہ اپنے فعل کا خود مختار تھا لیکن اجتماعی زندگی میں یہ ناممکن ہو جاتا ہے، یہاں دوسروں کا خیال غالب ہوتا ہے۔ تنہائی میں صرف اپنی زیست راحت سے بسر کرنے کی فکر ہوتی ہے اجتماعی زندگی میں نوع انسان کی زیست کی فکر اس پر اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

اب جبکہ انسان کا بالطبع مدنی الطبع ہونا ثابت ہو گیا تو ضرورت اس امر کی ہوئی کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا برتاؤ ایک دوسرے کے ساتھ کن اصول پر ہونا چاہیئے آیا اس کو اس کی ذاتی خواہشات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دینا چاہیے، یا اپنی ضروریات زندگی کو مقدم سمجھنا ضروری ہے جب ہر فرد کے انفرادی افعال جو زیست میں دخل رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے کیئے جائیں کہ وہ فاعل کی زیست کو راحت و آرام کے ساتھ عمر طبعی تک پہونچا دیں۔ تب وہ نافع للذات کہلاتے ہیں اور جب وہ اس اعتبار سے کیئے جائیں کہ اُن سے اپنی ذات کے برخلاف دوسروں کو فائدہ ہو تب وہ نافع اللغیر کہلاتے ہیں بالفاظ دیگر اپنے ذاتی مقاصد کی طلب کا نام انانیت

سے اور دوسروں کے مقاصد کی طلب کو اخوانیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

انسان میں راحت پسند اور صحبت پسند ہونا دونوں امر طبعی ہیں اور وہی تمام ان افعال کی بنا ہیں جن کا تعلق زیست سے ہے۔ اس لیے تمام افعال خواہ وہ نافع للذات ہوں یا نافع للغیر باہم ایسے وابستہ ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ تصاحب و تعامل کی حالت میں جس قدر نافع للذات افعال واجب ہیں اسی قدر نافع للغیر بھی واجب ہیں، اب وہ اشخاص جو صرف نافع للذات افعال کرتے ہیں اور نافع للغیر کو چھوڑ دیتے ہیں وہ اصول تصاحب و تعامل کو برہم کر کے قوم کی تباہی کا سبب ہوتے ہیں اور چونکہ خود بھی قوم کے ایک فرد ہیں اس لیے ہلاک ہو جاتے ہیں اسی طرح وہ اشخاص جو اپنا وقت عزیز زیادہ تر افعال نافع للغیر میں گذارتے ہیں اور ضروری نافع للذات افعال کی پروا نہیں کرتے وہ بھی بالآخر فنا ہو جاتے ہیں۔

ہربرٹ اسپنسر نے اس موضوع پر کافی توجہ کی ہے اور انانیت و اخوانیت دونوں میں توافق و تطبیق کی کوشش کی ہے۔ اس نے دکھایا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی میں بھی اگر افراط پسندی سے کام لیا جائے تو خود اس کی بربادی لازم آتی ہے اگر ہر شخص اپنے ہی اغراض کا طالب ہو تو کسی ایک فرد کی بھی غرض حاصل نہ ہو گی اس لیے کہ ہر شخص اکثر حالات میں دوسروں کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ اور تمام افعال اپنی زیست کے لیے انجام نہیں دے سکتا دوسری طرف اگر ہر شخص اپنی ذات کو تمام تر صرف دوسروں ہی کے لیے وقف کر دے تو یہ خود ان کے لیے

مضر ثابت ہوگا اس لیے کہ اگر ہر شخص خود اپنی بہتری سے بے پرواہی برتے تو وہ اس اہلیت اور قابلیت کو نقصان عظیم پہونچائیگا جو اس میں دوسروں کی اعانت کرنے ور اصل فائدہ مقصود ہونے کا۔ اس بحث کو فلاسفہ مذکور نے نہایت دلچسپ طریقہ پر بیان کیا ہے۔ دیانتدارانہ نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ہمارا مقصد نہ تو خالص انانیت ہونا چاہیے اور نہ محض اخوانیت بلکہ ان دونوں کی تطبیق و توفیق۔

لیکن یہاں اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوجائیگا کہ فی الحقیقت انانیت اور اخوانیت میں اس سے بھی کم فرق ہے جو نہایت سے جیسا کہ ہربرٹ اسپنسر کو نظر آتا ہے اس لیے کہ نفس کی حقیقی تکمیل صرف مقاصد اجتماعیہ ہی کی تکمیل سے ممکن ہے، جناب سینگل کا مقولہ ہے کہ ہم اپنی تکمیل اپنی ذات سے نہیں کر سکتے ہیں"۔ اور اس طریقہ سے ممکن ہے کہ ہم اپنی ذات کا تحفظ کر سکیں۔ بہت سی حد تک کلی نقطہ نظر سے قریب ہوتے جاتے ہیں یعنی وہ نقطہ نظر جس سے ہماری نگاہ میں اپنی شخصی بھلائی کسی دوسرے کی بھلائی سے زیادہ اہم نہیں رہ جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی انفرادی ترقی کا خیال دوسروں کی ترقی کے مقابلہ میں ہمارے لیے ہمیشہ لازمی ہے کیونکہ اپنی ذاتی ضرورتوں کو شخص خود ہی خوب سمجھ سکتا ہے اپنی ذاتی ترقی و تکمیل کے وسائل خود ہی خوب جانتا ہے لیکن اپنی ذات کی فلاح اندیشی جماعت کی فلاح اندیشی کے نقطہ نظر سے ہی ہو تو اس کو صحیح معنوں میں انانیت نہیں کہہ سکتا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک فرد کی تکمیل ہے لیکن جماعت کے لیے جس میں ذاتی خواہشوں

کر حتمی دفعیہ کے لیے قربان کر دیا جاتا ہے۔ وہ ذاتی ترقی دراصل مقصد اجتماعی ترقی
ہوتی ہے۔ جب یہ مسلم ہو جاتا ہے تو انانیت اور اخوانیت میں باہم تناقض نہیں رہتا
کیونکہ اس صورت میں ہم نہ صرف اپنی بھلائی چاہتے ہیں اور نہ محض دوسروں کی بلکہ
دونوں کی اور یہ تصور کر کے دونوں ایک ہی کل کے جزو ہیں۔

انفرادی ہستی بحیثیت ایک فرد ہونے کے بالکل ہیچ ہے۔ چنانچہ ارسطو نے
انسان کی تعریف یہ کی ہے کہ "وہ ایک سیاسی حیوان ہے" اور اخلاقیات پر جب تک
اس کو سیاسیات یعنی علم جماعت یا سوسائٹی کا ایک جزو نہ قرار دیا جائے تسلی بخش
بحث نہیں ہو سکتی کیونکہ جس قدر بھی فرائض وہ حقوق انسانی ہیں وہ سب قوم پر ہمارے
ایک دوسرے کے ساتھ باہمی روابط پر موقوف ہیں۔ گو جدید زمانہ میں انفرادیت
اور شخصی حریت کا دور نظر آتا ہے لیکن حکمائے قدیم کے خیالات اس کے بالکل بر
عکس معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ افلاطون کی مشہور کتاب جمہوریت سے ... میں
وہ انسان کی اجتماعی فطرت سے اس درجہ متاثر تھا اور اجتماعی پہلو سے حیات انسانی
کے مطالعہ کو اس قدر ضروری جانتا تھا کہ انفرادی اخلاق اور زندگی کی تحقیق
کی بجائے پہلے اس نے اچھی حکومت کے ممیزات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ان
پر کافی روشنی ڈالنے کے بعد اس کے نزدیک عمدہ شخص واحد کا پتا لگانا نہایت آسان
تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاقیات میں افلاطون کی سب سے بڑی تصنیف اس کی کتاب
جمہوریت ہے۔ جس میں اس نے ایک نصب العین حکومت کا خاکہ کھینچا ہے۔ یونانیوں

کی نام رسخ تسلیم کی روسے اس حکومت کے وجود کے لیے افلاطون کے نزدیک چار بڑے فضائل کا کسی شخص در میں پایا جانا ضروری تھا۔ یعنی حکمت۔ شجاعت عفت اور عدالت ان فضائل کی جو اہمیت حکومت کے لیے ہے اس سے وہ انفرادی زندگی میں ان کی اہمیت کا نتیجہ نکالتا تھا۔

نہ صرف افلاطون بلکہ ارسطو کو بھی انسان کے مدنی الطبع ہونے کا کچھ کم دعویٰ نہ تھا۔ اس نے اخلاقیات پر جو بہترین کتاب لکھی ہے اس کا حصہ اولین یہی ہے کہ اخلاقیات سیاسیات کا ایک جزو ہے جس کی تصنیف ان تمام فضائل سے جو کسی حکومت میں عمدہ شہریوں کے لیے ضروری ہیں اور جو وہ یونان میں موجود پاتا تھا۔ لہذا معلوم ہوا کہ یونانیوں کا بہترین علم اخلاق ایک اچھی حکومت کے تخیل پر مبنی ہے جس کے ذریعہ افراد کو اپنی زندگی کی تکمیل کرنا چاہیے۔ اور فرقہ رواقیہ یا (Stoic philosophy) کا مسلک صرف اس وقت وجود میں آیا جب کہ یونانی حکومت کا زمانہ گذر چکا تھا اور ان پر روم کے باشندے فاتحانہ حکومت کر رہے تھے۔

رواقیت کی روسے نکوکار انسان جس کو وہ حکیم کے نام سے موسوم کرتے تھے کسی خاص رشتہ اجتماعی کا پابند نہیں ہوتا تھا بلکہ خود اپنی مستقل اور آزاد زندگی رکھتا تھا لیکن باوجود اس کے وہ اس کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک اعلیٰ اخلاق عمدہ آدمی شہری ہوتا ہے، ان کی تعلیمات، جسمانی روحانی اور اخلاقی

بلند اور اعلیٰ تھیں لیکن اصول تمدن سے اجتماعی روابط کی ان میں بہت کمی پائی جاتی تھی جس نے ان کو زمانہ کی نظروں میں تقریباً بے معنی اور خارج از انسانیت بنا دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تعلیمات انفرادی آزادی کے قریب لفاظیوں کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے یہاں آکر ہم کو اس کا بھی انکشاف ہو جاتا ہے کہ مسیحیت میں رہبانیت کس حد تک جائز ہے۔ اس رواقیت کے اصول پر مسیحیت نے بھی یہی راہ اختیار کی تھی یہ یسائی مذہب کی بنیاد تھی بلا قید ملک وملت رواقیت ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افراد کی مستقل بالذات اور مستغنی عن الاجتماع حیات کی قائل نظر آتی ہے اس کا مسلک یہ ہے کہ ہر شخص کو خود اپنی نجات کی راہ نکالنی چاہیئے اور زندگی کے اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لیے والدین، اعزہ و اقارب اور دوست احباب تک کو چھوڑ دینا چاہیئے، چنانچہ بڑے بڑے خدا پرست جنگل بیابان یا پہاڑ کی کھوہ میں عبادت الٰہی میں مصروف رہنا پسند کرتے رہتے ہیں اور اس متمدن زندگی پر اس رہبانیت کی زندگی کو ہمہ وجوہ ترجیح دیتے ہیں لیکن اگر اصول مسیحیت اور اس زمانہ کے حالات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت کو اپنے زمانہ میں چونکہ ایک بالکل نئے حالات کی دنیا سے مقابلہ کرنا تھا اس لیے لازمی طور پر اس کو شروع میں رہبانیت پر کسی قدر زیادہ زور دینا پڑا لیکن جب اس نے کچھ عرصہ بعد ایک بڑی دنیا کو فتح کر لیا تو اس کا اجتماعی رُخ سامنے آنے لگا۔ اور بالآخر وہ اس امر پر زور دینے میں بھی کسی دوسرے مذہب

سے پیچھے نہیں رہا کہ سعدی

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

اور اسی کے کمال کے لیے خدا اور بندوں دونوں کے ساتھ اتحاد و اتصال ضروری ہو گیا۔ چنانچہ عیسائی دنیا میں بھی اب یہی رخ زیادہ اہم و ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد جب ہم مذاہب اسلام کی طرف نظر کرتے ہیں تو صاف الفاظ میں ہم کو نظر آتا ہے کہ لا رہبانیۃ فی الاسلام یعنی اسلام میں غیر متمدن زندگی کسی طرح جائز ہی نہیں ہے۔ اصول شرع یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ہم کسی طرح بھی غیر متمدن زندگی بسر کر کے عاقبت میں نجات کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ رہبانیت کی زندگی کو سرے سے ہی ناجائز بتانے میں اور اگر ذرا بھی غور و خوض سے کام لیا جائے، تو معلوم ہو گا کہ دراصل انسان ایک دوسرے کا دنیوی ضروریات میں اس قدر محتاج بنایا گیا ہے کہ وہ رہبانیت کی زندگی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ مسئلہ اس وقت بالکل صاف ہو جاتا ہے جب یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی خاص جگہ کے تمام باشندے رہبانیت کی زندگی بسر کرنے لگیں۔ قیاس اسکو تسلیم نہیں کر سکتا کہ ان کی مایحتاج اشیا کی فراہمی کس صورت سے ممکن ہے جب ایک اصول چند افراد کے لیے نہ صرف مشکل بلکہ محال محض ہو تو اقوام کے لیے وہ کس طرح قابل تقلید ہو سکتا ہے انسان کو شخصی زندگی قائم رکھنے والی چیزوں کے بعد جس اشد

ضرورت کا احساس ہوتا ہے وہ نوع انسان کے گروہ کو یکجا جمع ہو کر رہنے کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر انسان ذاتی طور پر بالکل آزاد ہے اور کوئی چیز اس کو مقید نہیں کر سکتی لیکن اس کا اگر دوسرا رُخ اُٹھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک دوسری حیثیت سے وہ اسقدر ضعیف اور عاجز ہے کہ اس کو اپنی زندگی کی حفاظت کی غرض سے اس آزادی کا ایک بہت بڑا حصّہ قربان کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے علمائے تمدن کا اتفاق ہے کہ انسان اپنی طبیعت کے برخلاف اجتماع کے لیے مجبور ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کی زندگی ناممکن ہے اور وہ اس سے کسی وقت بھی مستغنی نہیں ہو سکتا لہٰذا ظاہر ہے کہ وہ ایک دوسرے سے متحد ہو کر رہے۔

بجز دیوانوں اور فاترالعقل لوگوں کے باقی ہر شخص کی زندگی تقریباً ایک مربوط شیرازہ ہوتی ہے اس کے افعال کم و بیش ایک مرتب نظم و نسق کے تحت میں واقع ہوتے ہیں اول روز سے جب وہ اس عالم میں آنکھ کھولتا ہے تو اس کو ضروریات زندگی دوسرے کی طرف دست سوال دراز کرنے پر مجبور کرتی ہے، ایک شیرخوار بچہ کو جب بھوک بیتاب کرتی ہے تو وہ رو کر اپنی ماں سے دودھ طلب کرتا ہے جب وہ بڑا ہو جاتا ہے ستر پوشی کے لیے اس کو کپڑے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اس طرح جب شیر مادر سے اس کا تغذیہ ہو جاتا ہے تو حیوانات اور نباتات کی طرف اس کو اپنی توجہ مبذول کرنا پڑتی ہے جس قدر وہ ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر اس کی ضروریات زندگی بڑھتی جاتی ہیں اور روز بروز پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں۔

ان تمام ضروریات کو ایک فرد واحد کسی طرح تنہا انجام نہیں دے سکتا دیگر افراد
نیز ع مل کر اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں اور اس طرح ایک دوسرے کی
ضرورت کی انجام دہی میں وقت صرف کرتے ہیں۔

ایک بڑھئی عمدہ عمدہ کرسیاں، الماریاں اور انواع و اقسام کا فرنیچر تیار کرتا
ہے وہ سب اس کی ذات خاص کے لیے بالکل بیکار ہے لیکن ایک عمدہ کوٹھی یا محل
کے لیے نہایت ضروری ہے بڑھئی کو ہر چیز کی ضرورت ہے وہ اناج اور
کپڑا چاہتا ہے لیکن وہ خود اس کے پیدا کرنے یا بنانے سے عاجز محض ہے ایک کسان
غلہ بڑھئی کو مہیا کر دیتا ہے لوہار سے دیگر آلات زراعت لیتا ہے
دھوبی سے کپڑے دھلواتا ہے، درزی سے کپڑے سلواتا ہے۔ غرض ایک پیشہ ور
کا کام دوسرے پیشہ ور سے آسانی کر جاتا ہے۔ اور اسی طرح تمدن زندگی ترقی
کرتی جاتی ہے اب یہ جگہ کا جغرافیہ تمدن کہ وہاں کے باشندے کس طرح اپنی
زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی خاص قانون مقرر نہیں ہو سکتا۔ آزاد رو
سے آزاد رو درویش سے وحشی شخص بھی اپنے اجتماعی ماحول کے اثر سے کلیتہً محفوظ اور
غیر متاثر نہیں رہ سکتا۔ جو جماعت قوم یا نسل جس آب و ہوا یا خطۂ زمین میں بود و باش
اختیار کرتی ہے اس کے ماحول سے اثر پذیر ہونا اس کو ناگزیر ہے۔

اسی وجہ سے مختلف ممالک اور مذاہب کا تمدن مختلف ہوتا ہے یہی اخلاقی آب
و ہوا جس میں کوئی شخص زندگی گذارتا ہے اس کی خواہشوں کا اصلی عامل ہو جاتی ہے

لیکن اصولاً ہر انسان اپنی ذات کو ذات نہیں بلکہ کسی جماعت کا ایک جزو سمجھتا ہے یہ ایک ایسی واضح خصوصیت ہے کہ مِل جیسے مصنف تک نے جو بعض حیثیات سے سخت انفرادیت کا قائل ہے اسی پر زور دیا ہے وہ کہتا ہے کہ "اجتماعیت اس قدر فطری اور لازمی شے ہے کہ بعض غیر معمولی حالات یا تجرد کی کوشش کے سوا انسان اپنی ذات کا جماعت سے علیحدہ تخیل کر ہی نہیں سکتا اور جس قدر نوع انسان وحشیانہ عہد کی آزادی سے دور ہوتی جاتی ہے اسی قدر یہ شیرازہ زیادہ مستحکم و مضبوط ہوتا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسانی ماحول کی جو چیز کسی حالت اجتماعی کے لیے لازمی ہوتی ہے وہ روز بروز ہر فرد جماعت کے تخیل کا غیر منفک جزو بن جاتی ہے۔"

لہٰذا ہم جب کسی جماعت کو مشترک زبان، مشترک قانون، مشترک مذہب اور مشترک مقاصد کے رشتہ سے باہم پیوستہ دیکھتے ہیں تو ایک وسیع معنی کے لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کے تمام افراد ایک ہی عالم میں زندگی گزارتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں شخصی اور انفرادی امتیازات قائم رہتے ہیں، بعض اشخاص ان مشترک رشتوں سے کم وابستہ ہوتے ہیں اور بعض زیادہ، بلکہ بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر لحظہ ہر آن ان میں سے ہر ایک کے عالم میں کافی تغیر واقع ہوتا رہتا ہے، تاہم مقامی رسوم و ماحول کا اثر ان کے شخصی امتیازات پر غالب ہوتا ہے۔ دوسروں کے متعلق معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

روز مرہ کے کاموں میں ایک دوسرے کی احتیاج بطور خود ہی کسی جماعت کے افراد میں ایک مجانست و موانست پیدا کر دینے کے لیے کافی ہیں اور جب اس پر تعلیم و تربیت کا اضافہ ہو جاتا ہے تو اس کی قوت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی زندہ مثال ہماری آنکھوں کے سامنے اہل یورپ اور بالخصوص اہل امریکہ موجود ہیں یہ لوگ ایک زبان رکھتے ہیں ایک قانون کی کڑی سے منضبط ہیں اور رہنے تمام اجتماعی مقاصد میں بھی ہم آہنگ ہیں تعلیم و تربیت تجارت و نسبت ہونے پر سہاگا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ متمدن دنیا اسی سرد بلا زندگی میں با فراغت بسر کرتے اور دیگر اقوام پر بہت سی باتوں میں فوقیت رکھتے ہیں۔ موجودہ عظیم الشان جنگ میں امریکہ کا نمایاں حصہ اظہر من الشمس ہے۔

برخلاف اس کے ہندوستان ہے جہاں چپہ چپہ کی زبان مختلف، ہر قوم و جماعت کا مذہب نیا، ہر ایک کا جدا گانہ تمدن نہ کوئی غرض نہ غایت مشترک نہ انس و موانست ایک دوسرے کا دشمن ایک کی ترقی دوسرے کے لیے باعث حسد ہے۔ تنگ نگاہی کا یہ عالم ہے کہ محنت کسی ایک فرقہ کے باعث دوسری جماعت کے لیے باعث ننگ و عار ہے اور ایک قوم کا اکل و شرب دوسروں کے لیے باعث تضحیک و استہزا ہے۔ جہاں مغائرت کا یہ عالم ہو وہاں کی تمدنی حالت اور ترقی ظاہر ہے۔ اقوام سے لیکر ایک ایک فرد تک تمدنی زندگی سے کوسوں پیچھے ہے اور مجبوراً تقلید کا حامی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہمیشہ سے کسی نہ کسی متحد قوم کے زیر

اثر رہا ہے۔ اور ان کے طرز اور تمدنی معاشرت کو احتراماً واجب سمجھتا ہے۔

زمانہ حال کے مختلف مصنفین اس خیال سے متفق ہیں کہ جس طرح کسی حیوان کے جسم کے تمام اعضا میں ایک مشترک جان کام کرتی ہے۔ اسی طرح کی ایک مشترک حیات انسانی جماعت کے مختلف عناصر و افراد میں بھی پائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس خیال کو تمثیل کے پیرایہ میں پیش کرتے ہوئے سماج کو عضویہ سے حیوانی یا نباتاتی اجسام کی ساخت میں بڑی مماثلت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی تشبیہات بعض وقت غلط فہمی پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان سے بصیرت اور حقیقت رسی کی بجائے ذہانت اور طباعی کا ثبوت زیادہ ملتا ہے۔ بہر حال انسانی شخصیت کوئی مستقل بالذات ہستی نہیں ہے بلکہ دوسری شخصیتوں کے ساتھ ربط اور تعلقات رکھے بغیر اس کا تصور تک ناممکن ہے۔ انسان کی زندگی کا دارومدار ہے روابط جماعت پر جو جن سے الگ کرلینے کے بعد یہ فنا ہوجاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی عضو کو جسم سے کاٹ لیں تو وہ مردہ ہوجاتا ہے۔ آدمی کی زندگی جس عصر اجتماعی اور جن اخلاقی رسوم و عوائد میں نشوونما پاتی ہے وہی اس کی اخلاقی زندگی کا تمام تر آب و رنگ ہوتے ہیں۔

فرائض تمدن

جہاں ماہرین فلسفہ متفقہ طور پر اس کے قائل ہیں کہ نوع انسانی کے تمدن پر ملک یا آب و ہوا، غذا اور زمین اور

مناظر فطرت اپنا کافی اثر ڈالتے ہیں وہاں یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان سب میں سب سے زیادہ نتائج جس چیز سے انسانی تمدنی زندگی پر مترتب ہوئے ہیں وہ اس کی فراہمی دولت ہے ہر ملک و ملت میں جب ایک خاص حد تک دولت جمع ہو جاتی ہے اس وقت وہ مختلف طریقوں سے ترقی کرنا شروع کرتے ہیں، خود علم کی ترقی، دولت کی افزونی سے وابستہ ہے جس وقت تک ہر فرد خود اپنی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے میں ہمہ تن مصروف رہے گا۔ اس وقت تک نہ تو کسی کو اعلیٰ ترین مشاغل کا ذوق و شوق ہو گا۔ اور نہ اس کی فرصت ملے گی کہ کوئی جدید ترقی کی جا سکے۔ اگر کسی سوسائٹی کے تمام افراد اس قدر صرف کر دیں جس قدر کہ وہ کماتے ہوں تو ان کے پاس کچھ سرمایہ ان لوگوں کے لیے نہ بچے گا جو فراہمی سرمایہ کے ناقابل ہیں لیکن اگر خرچ سے آمدنی زیادہ ہو گی تو بہ فراغت لوگوں کی ایک ایسی جماعت قائم ہو جائے گی جو زیرک و فہم و عقل و دانش میں اپنے سے زیادہ متمدن ممالک سے کسی طرح کم نہ ہوں گی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملک ترقی کرتا چلا جائے گا۔ اس وقت اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی کہ تمام اشخاص انفرادی حیثیتوں سے علیحدہ علیحدہ رزق رسانی کے لیے محنت کریں بلکہ وہ اپنا وقت اس سے زیادہ کارآمد کام میں صرف کریں گے اور علم و عقل کی روشنی میں مختلف طلسمات نیرنگ عالم دیکھ سکیں گے اور اس طرح ایجاد و اختراع کا دروازہ کھل جائے گا۔

اب ہم اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ قوانین انسانی اور حقوق الناس متمدن زندگی میں کس درجہ اثر رکھتے ہیں۔ یہاں یہ امر واضح ہو جانا چاہیئے کہ کسی سوسائٹی کی عادلانہ تنظیم کا انحصار صرف اکراہ اور اجبار پر موقوف ہوتا ہے۔ اس میں سلاطین وقت یا ان کے قوانین مروجہ کو بہت کم دخل ہوتا ہے کیونکہ وہ اقوام جو بالطبع مطلق العنان ہوتی ہیں ان کے لیے رعب سلطانی اور قوانین ملک بالکل بے اثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح پر وہ اقوام جو اصل معنوں میں امن پسند اور عاقل ہو جاتی ہیں تو ان کے لیے بھی قوانین کی فطرتاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی جو قوانین کہ ایک خاص وقت میں مفید ثابت ہوتے ہیں وہی دوسرے وقت بے کار اور بتدریج مضر ہونے لگتے ہیں۔ اس لیے بہترین اصول یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں سخت اور قطعی قوانین و ضوابط قائم کیے جائیں افراد میں اس امر کی کوشش کی جائے کہ ان میں فضائل حسنہ پیدا ہوں اور اعمال و افعال پسندیدہ پیدا ہوں لیکن ابتدا میں ناروا آزادی کی روک تھام کے لیے قوانین کا وجود ضروری ہے۔ چونکہ جس چیز کو لوگ اول خوف سے کرتے ہیں وہ بتدریج عادت ہو جاتی ہے اور پھر اسی کو وہ اپنی شعوری آزادی سے انجام دینے لگتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اول قانون وجود میں آتا ہے پھر عادت اور پھر نیکی اصل منشائے قانون لوگوں کے حقوق و فرائض کی اقامت اور تنظیم ہے اور یہ دونوں چیزیں باہم لازم و ملزوم ہیں جب ایک شخص کوئی حق رکھتا ہے

تو دوسروں پر نہ صرف اس کی خدمت فرض ہو جاتی ہے بلکہ ساتھ ہی کما حق کو فلاح عامہ کے لیے استعمال کرنے کا فرض بھی اس پر عائد ہو جاتا ہے۔ یعنی مخلوق انسانی کے یہ معنی ہیں کہ رفاہ عام کے لیے اس کو بعض چیزوں کا مالک بنا دیا گیا ہے۔

حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اول حقوق اللہ دوم حقوق العباد۔ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ غایت تخلیق اشرف المخلوقات کی بنا یا انتہا یہ ہے کہ دونوں قسم کے حقوق کو اپنی زندگی میں کامل طور پر انجام دینا ہے۔ حقوق اللہ سے وہ فرائض مراد ہیں جو خالق مطلق نے اپنی مخلوق کے ذمہ عائد کیے ہیں۔ ان حقوق کا ادا کرنا ہر فرد انسانی کے لیے فرض ہے خالق مطلق کی رضا جوئی ہی ان سے مقصود ہے۔ اگر ان کی غرض و غایت خوشنودی خالق نہ ہوگی تو وہ بے کار ہوں گے۔ حقوق اللہ کی بابت اس قدر کہنا کافی ہے۔

دوسرے حقوق العباد ہیں۔ ان میں سے بعض حقوق وہ ہیں جن کا تعلق افراد کی صرف اپنی ذات سے ہوتا ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو ایک شخص کے ذمہ دوسرے کے حقوق بحیثیت نوع انسان واجب ہیں ان میں سے سب سے پہلے ہم ذاتی فرائض کو لیتے ہیں۔ ہر شخص بخوبی واقف ہے کہ ترکیب انسانی دو اجزا سے ہوئی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل ممتاز ہیں۔ ان میں سے ایک جسم اور دوسرا روح ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ان کی

طبائع بالکل متغائر ہیں لیکن ان دونوں میں ایسا عجیب و غریب اتحاد پایا جاتا ہے
کہ ایک کے متاثر ہونے پر دوسرا ضرور متاثر ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر انسان پر یہ فرض
ہے کہ وہ ان دونوں جوہروں کی حفاظت بخوبی کرے۔ علامہ لاک لکھتا ہے کہ
"وہ سعادت و فلاح جس سے دنیا میں فائدہ اٹھانا انسان کے لیے ممکن ہے
اس کے واسطے دو چیزیں لازمی ہیں اول عقل صحیح دوسرے جسم سالم۔ یہ دونوں
نعمتیں ہر دیگر نعمتوں کی اصل ہیں۔ اور جس شخص کے پاس یہ دونوں موجود ہیں
وہ خوش قسمت ہے۔ کیونکہ یہی دونوں سعادت اور شقاوت کی بنیاد ہیں۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو دو قسم کی ضروریات ہوتی ہیں ایک وہ
ضروریات جو نفسانی سعادت اور روحانی فلاح کو مستلزم ہیں اور دوسری
وہ ضروریات جو جسمانی سعادت کو مستلزم ہیں اب نفسانی یا روحانی ضروریات
تو وہ ہوئیں جن کے استعمال میں لانے سے انسانی نفس صحیح سالم اپنے فرائض
کی انجام دہی کے قابل رہتا ہے جو اس دنیوی زندگی میں اس کے ذمہ فرض
کیے گئے ہیں۔

اب ان حقوق الناس میں سے جن کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا
ہے منجملہ دیگر حقوق کے اہم ترین حقوق حقوق زندگی آزادی، ملکیت، معاہدہ
اور تعلیم قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

انسانی حقوق میں مقدم ترین حق زندہ رہنے کا ہے۔ اس سے مطلب

یہ ہے کہ تکمیل نفس ایک شخصی چیز ہے۔ ورنہ اگر اسکو غیر شخصی چیز تصور کر لیا جائے
تو پھر شخصی حیات اس پر قربان ہو سکتی ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ
جس نفس یا شخصیت کی تکمیل مقصود بالذات ہے وہ دراصل انفرادی نہیں ہے
بلکہ ایک حد تک اجتماعی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض مواقع ایسے پیش آتے ہیں
جہاں افراد کی قربانی جماعت کے لیے مستحق قرار دی جاتی ہے۔ لیکن یہ صورتیں در
اصل مستثنیات میں سے ہوتی ہیں۔ عام طور پر یہ اصول مسلمہ ہے بلکہ عمومی
حیثیت سے انسانی فلاح انسانی حیات کی بقا اور اس کا تحفظ اس کی مقتضی ہے۔ اس
لیے حرمت حیات کو تمام حقوق میں اول ہے۔ غیر متمدن اقوام میں اس حق
کی حرمت کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اپنے ذاتی فوائد کو محفوظ رکھ کر بچوں کو معرض ہلاکت
میں ڈال دیتے ہیں۔ اسیران جنگ اکثر بے دریغ تہ تیغ کر دیئے جاتے ہیں۔
متمدن اقوام اس حق کا پاس و ادب زیادہ کرتی ہیں۔ اور حتی الوسع ان مواقع
سے احتراز کرتی ہیں۔ جہاں اس حق کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔
حق زندگی کے بعد حق آزادی ہے۔ انسان فطری اور خلقی طور پر آزاد پیدا
کیا گیا ہے اس کو آزادی کی طرف رہنمائی کرنے کے لیئے کسی ہادی کی ضرورت
نہیں ہے۔ کیونکہ انسان میں آزادی کا احساس منجملہ ان احساسات کے ہے جس کی
طرف انسان فطرتاً مائل ہوتا ہے۔ یہی وہ آزادی ہے جس کا شعور ہر ذی عقل انسان
اپنے نفس میں پاتا ہے تمام تاریخی واقعات اور حادثات جو تمام اقوام میں ہوئے ہیں

اسی آزادی پر مبنی ہیں۔ وہ کون سی آزادی ہے جس کے وصول کی غرض سے یورپ نے نہایت جاں بازی کے ساتھ جہاد کیا ہے اور اپنی عزیز جانیں قربان کر دی ہیں؟ وہ کون سی آزادی ہے جس کی نسبت میسو ڈی ڈیو (Deveuxe) کہتا ہے کہ "آزادی دنیا کی ہر قسم کی سعادت و فرح سے افضل ہے" اور جس کی نسبت میسو ... کہتا ہے "آزادی سرمایہ انسانی ترقی کی اصل اصول ہے" اور جس کی وکٹر ہیوگو اس طرح تعریف کرتا ہے "آزادی ایک ایسی ہوا ہے جو نفس انسانی کی زندگی کے لیے ایک ضروری چیز ہے" کیا اس آزادی سے یہ مراد ہے کہ انسان تمام قیود اور ہر قسم کے روابط سے آزاد ہو کر محض بے قید اور مطلق العنان ہو جائے۔ اگر آزادی کو اس کے ہم معنی کہا جاتا ہے تو یہ اس لفظ کا ناجائز استعمال ہے۔ خودسری یا مطلق العنانی کسی حالت میں بھی کسی خوش نظم یا متمدن سوسائٹی میں جائز قرار نہیں دی جا سکتی ہے۔ اس سے تو یہ مراد ہو گی کہ کسی جماعت کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ جو اس کا دل چاہے کرے۔ وہ آزادی جس کے اشتیاق میں تمام قوموں کے فلاسفر بے چین ہیں وہ معتدل آزادی ہے جس کی بدولت انسان اپنی تمام قوتوں کو جو قدرت سے اس کو عطا کی گئی ہیں بغیر کسی مزاحمت و خوف کے استعمال کر سکے۔ بشرطیکہ وہ ان حدود مقررہ سے متجاوز نہ ہو جو عادلانہ قوانین نے قرار دیدی ہیں کیونکہ اگر ان حدود سے تجاوز نہ ہو گا تو وہ قوم کے دیگر افراد

کے لیے مضر ثابت ہوگا اور اس طرح اصول تمدن کے خلاف ہوگا۔

اس معتدل آزادی کے ضمن میں نفس کی آزادی، عقلی آزادی اور علمی آزادی آسکتی ہیں۔

حق آزادی کے بعد حق ملکیت آتا ہے اس سے جو فرض عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کو عاقلانہ اور عادلانہ طور پر فلاح عامہ کے لیے استعمال کیا جائے وہ اقوام جو اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتی ہیں ان کو یہ حق نہیں دینا چاہیے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی اقوام میں یہ حق بالکل مفقود ہے۔ افلاطون کا یہ خیال ہے کہ ایک اعلیٰ نظام حکومت میں تمام چیزیں مشترک ہونا چاہئیں۔ اس کے نزدیک ملکیت شخصی کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ یہی وہ اصول ہے جس کی بنا پر زمانہ موجودہ میں بالشویک حق ملکیت کو شخصی ملکیت سے نکال کر ہر فرد بشر کو یکساں مشترک ملکیت میں دینا چاہتے ہیں وہ افلاطون کے اس معنی میں بھی ہم عناں ہیں کہ عقد یا نکاح بالکل فضول شے ہے۔ توالد و تناسل یا ترقی نسل کے لیے من جملہ دیگر اشیاء کے عورت کو بھی کسی شخص کی ملکیت میں نہ ہونا چاہیے اس مشترک یکساں ملکیت سے جو اقوام کو نقصان پہنچتے ہیں ان کا اندازہ ان اقوام کی حالت دیکھنے سے بخوبی ہو جاتا ہے جن میں یہ اصول عرصہ تک رائج رہے ہیں۔

دیگر اشیاء کی مشترکہ ملکیت میں سے جو ایک حد تک ناممکن الوقوع ہے صنف نازک کو ہی لیجئے کہ جن مذاہب یا اقوام میں اس کا رواج ہے وہ آج مہذب اور متمدن

اقوام میں کس نظر سے دیکھے جاتے ہیں اگر غور سے کام لیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ دراصل بے ایمانی [illegible] بے شرمی کے مجسمے ہیں۔

حق معاہدہ وہ اخلاقی ذمہ داری ہے جس سے ہر ایک دوسرے سے جو معاہدہ ہوا اس کو پورا کرنا اس کا فرض ہوتا ہو [illegible] کوئی شے ہی نہیں ہوتی اور ایفائے عہد سے شخص یا انفرادی مخصوص ہوتا ہے۔ وہاں قوت [illegible] دوسرے اشخاص سے توقع [illegible] اپنا کام [illegible] چنانچہ اسی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ جماعتیں اپنی طبعی [illegible] کی طرف ترقی کرتی ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ ہر متمدن سوسائٹی کا یہ فرض ہے کہ وہ اس عہد یا معاہدہ کو جو آپس میں طے ہو ہر حالت میں پورا [illegible] کے ساتھ وفا کرے اگر ایفائے عہد کسی سوسائٹی سے مفقود ہو جائے [illegible] کے افراد میں اتحاد و ہمدردی [illegible] ایک منٹ بھی قائم نہیں رہ سکتا اور نتیجہ یہ [illegible] سوسائٹی کی بربادی ہو جاتی ہے۔

اسی طرح تعلیم سے وہ حق مراد ہے [illegible] کے ذریعے سے نفس ناطقہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایک اعلیٰ نظام اور متمدن سوسائٹی کے لیے نہ صرف تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم ضروری اور لازمی چیز ہے جس کے بغیر متمدن ہونا محال ہے۔ تمام کتب سیر اس پر شاہد ہیں کہ تمام وہ اقوام اور ممالک جو تمدنی ترقیات میں پیچھے ہیں وہ ہمیشہ سے تعلیم سے بالکل بے بہرہ رہی ہیں غیر متمدن زندگی کے زنگ کو جو چیز صیقل کر کے صاف کرتی ہے

اور اس کو اچھا کر متمدن طبقہ سے لا ملاتی ہے وہ صرف تعلیم ہے اس سے واضح ہو گیا کہ تمام جماعتوں کے لیے جو تمدنی زندگی میں فائق ہونا چاہتی ہیں یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے افراد کی تعلیم کا اعلیٰ انتظام کریں آج تمام وہ اقوام جو مدارج تمدن کے ملائے اعلیٰ پر نظر آتی ہیں صدیوں پہلے سے اپنے افراد کی تعلیم میں منہمک اور سر گرداں رہتی ہیں جب ان کے نفوس عاقلہ کی پوری طور پر تکمیل ہو چکی تو زمانہ کے متمدن افراد میں شمار ہونے لگی ہیں۔ یہاں تعلیم سے مراد کوئی خاص تعلیم مغربی یا مشرقی یا کسی خاص مذہب یا قوم کی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ تعلیم ہے جس کے ذریعے سے دماغ نشو و نما پا کر جہالت کی تاریکیوں سے نکل جاتا ہے۔

ان تمام حقوق الناس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ جس قوم و ملت کے ہم فرد ہیں اس کی اعلیٰ ترین ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ہماری زندگی کے نشو و نما کو جو ذرائع اور وسائل درکار ہیں ان پر ہم کو پورا حق حاصل ہو اور تمام ذرائع اور وسائل کو اسی مقصد کے لیئے استعمال کرنا ہمارا تمدنی فرض ہونا چاہیئے۔

ترکیب تمدن انفرادی ہستیاں جب کسی ایک رشتہ میں منسلک ہوتی ہیں تو ان کی مختلف صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ من جملہ ان کے سب سے اوّل مجموعہ ایک خاندان یا قبیلہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ جماعت چند افراد کے باہم رشتہ قرابت سے وابستہ ہونے کا نام ہے۔ اس کا اصل اصول

موانست فطری ہوتی ہے اور یہی اس کے قیام کا باعث ہوتی ہے۔ اس کا مقصد
دراصل بیچارگی طفولیت کی حفاظت و خبرگیری اور فطری محبت و موانست کے ساتھ
ایک دوسرے سے ربط و اتحاد ہے۔ یہ نظام قدرتی طور پر اس خوش اسلوبی سے
انجام پاتا ہے کہ کوئی دوسرا انتظام ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایام طفولیت یا شیر خوارگی
میں جو حفاظت اور خبرگیری والدین کرتے ہیں وہ بہتر سے بہتر بھی کوئی نظام
سلطنت نہیں کر سکتی۔ اسی طرح دوستی کا دائرہ جس قدر کم ہوگا۔ اسی قدر اس
میں پایداری اور خلوص زیادہ ہوگا۔ خاندان کا ایک بزرگ مثل بادشاہ کے
ہوتا ہے اس کے خرد سب اس کے احکام کے ماتحت ہوتے ہیں۔ حسب مشورہ
خاندان وہ تمام امور کی انجام دہی کے لیے حسب مراتب احکام نافذ کرتا ہے۔
اور اس طرح تمام خاندانی کام انجام پاتے ہیں۔ اندرونی اور بیرونی تمام
معاملات خاندان کے سامنے پیش ہوتے ہیں اگر کوئی مسئلہ متنازع فیہ ہوتا ہے
تو وہ ہر دو فریق کے بیانات سن کر بزرگ خاندان کے ہاتھوں سے طے پاتا
ہے۔ گویا خاندان ایک جمہوریت کا نمونہ ہے۔ گو چھوٹے پیمانہ پر ہو مگر اصول بالکل
یکساں ہوتے ہیں۔ اسی طرح چند خاندان مل کر جو ایک جماعت ہوتی ہے اس کو قوم
کہتے ہیں۔ قوم میں بھی مثل خاندان کے تمام ان حقوق کی بدرجۂ اکمل پابندی
ہوتی ہے۔ تمام قوم کا ایک سردار قرار دیدیا جاتا ہے اور اس کے مشورہ کے
مطابق تمام قوم کے مراحل طے پاتے ہیں۔ ہر فرد قوم کا اخلاقی فرض ہوتا ہے

کہ وہ تمدنی ذرائع کی پابندی سے ایک قوم بحیثیت اپنی ذات کے بمقابلہ دوسری اقوام کے [illegible] بیرونی [illegible] سے حفاظت اور اندرونی معاملات کی تنظیم کی خاطر [illegible] ہو جاتی ہیں تو اس سے ایک مرکزیت کی بنیاد پڑتی ہے اور اس تنظیم کا [illegible] سلطنتیں معرض وجود میں آتی ہیں۔

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے [illegible] فطری [illegible] ہوتی ہے لیکن اس سلسلہ سے قطع نظر [illegible] تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے بالکل [illegible] ہی شروع ہوتی ہے۔ اس کو کوئی [illegible] ضرورت سے پیدا ہوتا ہے [illegible] تعلقات قریبہ نہ ہوتے ہیں۔ یہاں افسر و [illegible] کے تعلقات ہوتے ہیں۔ اگر یہ خاندان میں بھی [illegible] حاکم و محکوم [illegible] حیثیت جداگانہ ہوتی ہے وہاں کوئی ایک مربی اپنے [illegible] کی حیثیت سے تعلیم و تربیت کرتا ہے۔ یہاں صرف ایک معاہدہ ہے جس کے لیے وہ ایک خاص کام کے لیے مقرر ہوتا ہے اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے لیے ایسے قوانین و ضوابط ترتیب دیئے جائیں جن سے ماتحت لوگوں پر تشدد نہ ہو سکے۔ اور حاکم محکوم کو درجہ غلامی تک پہنچا سکیں

زمانہ گزشتہ اور حال کا موازنہ ہم کو یہ بتاتا ہے کہ جس قدر زمانہ تمدنی ترقیات میں گامزن نظر آتا ہے اسی قدر خلوص و موانست میں کمی اور رسم و رواج میں

ترقی روزافزوں ہوتی جاتی ہے۔ زمانہ سابق میں ایک آقا اور خادم کا باہمی کاروباری تعلق مثل ایک خاندانی تعلق کے ہوتا تھا۔ جو معاہدہ کاروباری حاکم و محکوم میں ہوتا تھا وہ موانست و خلوص کی زنجیر سے مستحکم ہوتا تھا۔ آقا کا اخلاق خادم کے اخلاص پر پرمنٹ کا کام کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آقا کا برتاؤ سرپرستانہ ہوتا تھا اور خادم کا طرز عمل مؤدبانہ اور مخلصانہ۔ آقا کی خوشحالی اور نیک نامی سے خادم کو دلی مسرت ہوتی تھی اور اس پر کسی قسم کی مصیبت خادم کے لیے سوہان روح ہوتی تھی۔ لیکن یہ زمانہ کی باتیں محض افسانہ ہو کر رہ گئی ہیں کہ وفادار خادم اپنے آقاؤں کے لیے اپنی عزیز جانیں تک قربان کردیتے تھے۔

اسی طرح استادوں اور شاگردوں کا برتاؤ مخلصانہ اور مربیانہ ہوتا تھا۔ شاگرد اپنے استاذہ کا خیال اپنے والدین سے زیادہ کرتے تھے۔ ان کے ادب میں اپنی بہبودی تصور کرتے تھے۔ کسی خاص علم کے استاد کی شاگردی کو اپنا فخر جانتے تھے اور صدہا کوس کی منازل پاپیادہ طے کرکے ان کے پاس پہنچتے تھے اور بالآخر ارسطو زماں اور افلاطون دوراں ہوتے تھے۔ علمائے سلف کے سوانح اس پر شاہد ہیں کہ وہ اپنے شاگردان رشید کو مثل اپنی اولاد کے تربیت دیتے تھے اور سچے دل سے چاہتے تھے کہ جو کچھ وہ خود جانتے ہیں وہ سب اپنے شاگردوں کو ذہن نشین کرادیں۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر شاگرد اپنے استاد سے

کسی خاص فن میں زیادہ ماہر ہوجاتے تھے جن پر خود اُستاد فخر کرتے تھے اور وہ ان کے لیے مایۂ ناز ہوتے تھے اور اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ اُستاد او رشاگرد کا برتاو بے حد خلوص پر مبنی ہوتا تھا۔

برخلاف اس کے موجودہ زمانہ میں ہر طالب علم یہ سمجھتا ہے کہ وہ کچھ روپیہ خرچ کرتا ہے بس کے بدلہ اس کے اُستاد کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کو تعلیم دے اور وہ بھی ایک خاص وقت معینہ پر۔ استاد یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک مقررہ رقم کے عوض، ایک محدود وقت میں اپنا کچھ حصہ وقت صرف کریں بلا لحاظ اس کے کہ ان کا مقصد اصلی حاصل ہو یا فوت۔ نہ ایک دوسرے کا خیال، نہ ادب، او رنہ پاس، نہ اخلاص، نہ مودت۔ نتیجہ یہ ہے کہ شاگرد محض ڈگری یافتہ عالم بے عمل ہوتے ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب مربیانہ تعلق کسی فطری رشتۂ محبت پر مبنی نہیں ہوتا تو اس میں کسی قسم کا خلوص باقی نہیں رہتا محض رسمی ضابطہ کی خانہ پری رہ جاتی ہے اور آگے چل کر اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ اب اگر کاروباری تعلقات خالص معاہدانہ حیثیت کے ہونگے تو ایک حد تک ناانصافی کے لیے ضرور سدباب ہوجائیگا اور پھر خود بخود رفق وفاداری اور محبت کے جذبات پیدا ہوجائیں گے لیکن اگر خود معاہدہ ہی محض رسماً اور رواجاً ہوگا تو اس کا اثر بالکل برعکس ہوگا۔

اپنے [illegible] تنخواہ دار مزدوروں کے کام کرنے کے لیے [illegible] جاتا [illegible]

[illegible] تعلقات [illegible] جاسکتے ہیں [illegible] [illegible] کا [illegible] وسائل تعلیم کی فراہمی [illegible] بصورت حفظ ما تقدم اشیائے خوردنی میں میل یا اور دھوکہ بازی کا انسداد اسی طرح وہ لوگ جو محنت مزدوری کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتے ان کے لیے ضروریات زندگی کی فراہمی وغیرہ یہ سب امور تمدنی زندگی کے لیے لازمہ انسانیت ہیں۔

اس تمام [illegible] کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ آیا کسی قوم کو [illegible] کی طرف قدم بڑھانا چاہیے یا اشتراکیت کی طرف اس مسئلہ پر [illegible] گروہ [illegible] مختلف رائے رکھتے ہیں۔

جماعت اول [illegible] کہتا ہے کہ [illegible] آزادی کو قائم رکھنا زیادہ [illegible] اگر وہ اشتراکیہ [illegible] شے فرد کے خیال [illegible] مستقل [illegible] لیکن اگر غور کیا جائے تو

ان دونوں مخالف آراء کی تطبیق اس صورت سے بآسانی ممکن ہے کہ نہ تو کل کی فلاح بغیر افراد کی فلاح کے ممکن ہے اور نہ ہر شخص کو انفرادی آزادی بغیر اس شرط کے دی جا سکتی ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اس سے کوئی عام فلاح مضر ہو۔ لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ ان چیزوں میں لوگوں کو زیادہ آزادی دینا مستحسن ہے اور کن چیزوں میں ان کے افعال کی نگرانی اور تحدید ضروری ہے۔ بہرحال زمانہ موجودہ عمومی ترقی کے لیے انفرادیت کو زیادہ دخل دیتا ہے اور فی الحقیقت یہی اصل تمدن ہے۔

سیاست مدن یہ [illegible] تمام چیزوں میں حکمت عملی کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو ایک قوم [illegible] یا ایک شہر یا ایک ملک کے باہمی تعلقات کے حفظان کے متعلق اُن اصول سے بحث کرتا ہے جس سے تمام افراد میں طریقہ عدالت جاری اور ساری رہتا ہے اور جس کی وجہ سے تمام افراد ترقی اور بہبودی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

[illegible] کے لیے تعاون و تعادل کا لازم ہونا بیان کیا جا چکا ہے [illegible] سوسائٹی میں علی و ادنیٰ ہر شخص [illegible] لیکن بعض اوقات [illegible] ادنیٰ پر ایسے جبر دباؤ ڈالتا ہے اور اس کی آزادی میں [illegible] اس لیے یہ ضرورت پیش آئی کہ ابنائے جنس ایک دوسرے کی آزادی [illegible] سے محفوظ رہیں اور ہر شخص سوسائٹی میں اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق عمل کرتا رہے اور اگر کوئی ایسا کام کرے جس سے سوسائٹی

کو نقصان پہنچے تو اس کو سزا دی جائے تاکہ آئندہ اس کو تنبیہ اور دیگر افراد کو عبرت حاصل ہو۔ تمدن کی ابتدائی حالت میں تمام سوسائٹی کو یہ اختیار تھا کہ جب سوسائٹی کے کسی ممبر سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا تو سب مل کر اس کے لیے سزا تجویز کر دیتے تھے۔ جرائم اور مجرموں کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف سزائیں تجویز کی جاتی تھیں اور اسی کے مطابق ان کو فیصلہ سنایا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان مختلف فیصلوں نے قانونی صورت اختیار کر لی اور سوسائٹی کے ان اقتدارات کا نام جو لوگوں میں قاعدہ عدالت قائم رکھیں اور جو فرد اس قاعدہ کے خلاف ورزی کرے اس کو سزا دیں سیاست کہلانے لگا۔

شروع میں ہر مقدمہ میں سوسائٹی کے ہر فرد کو رائے دینے کا استحقاق یکساں تھا اور ہر ممبر کو یہ حق تھا کہ وہ قانون وضع کرے اور اس کا نفاذ کرے گویا اس میں ایک جمہوری سلطنت کی سی شان تھی۔ لیکن جب متمدن سوسائٹی میں ترقی ہوئی اور افراد میں ان کے حالات اور مذاق کے اعتبار سے کام تقسیم ہوئے تو ایک مقدمہ کے لیے تمام افراد کا جمع ہونا نہ صرف ان کے ذاتی کاموں میں ہی خالج ہوا بلکہ ایک طرح محال ہو گیا اس لیے انفصال مقدمات کے اختیارات ایک شخص واحد کو دیدیئے گئے اور اس کا نام قاضی یا منصف ہوا لیکن قوانین سازی سوسائٹی کے ہاتھ میں رہی۔ منصف کا کام ان منضبط قوانین قوم کے مطابق مجرموں کو سزا دینا قرار دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی ضرورت بھی پیش آئی

کہ اس سوسائٹی، شہر یا ملک کی حفاظت بیرونی حملوں سے کی جائے تاکہ امن قائم رہے اس لیے فوج کا قیام ضروری ہوا۔ جماعت میں سے چند اشخاص جو اس کام کے لیے موزوں ومناسب تھے فوج میں بھرتی کئے گئے اور ان کا جداگانہ قانون بنایا گیا۔ صلح وجنگ کا اختیار اور اس فوج کی عنان حکومت ایک خاص شخص کی سپرد کی گئی تاکہ وہ صرف یہیں امور پر اپنا وقت صرف کرے۔ اسی کو اندرونی اور بیرونی نقصانات کی تلافی کے تمام اختیارات دیئے گئے اور اس کا نام حاکم یا بادشاہ ہوا۔ اب فوج کے لئے جو بجز محافظت قوم اور کوئی کام انجام نہیں دے سکتی تھی یا حاکم وقت کی ضروریات کے لیے خرچ کی ضرورت لاحق ہوئی۔ چونکہ وہ اپنے لیے جداگانہ اکتساب معاش سے قاصر تھے اس لیے تمام سوسائٹی کے ذمہ ایک محدود رقم مقرر کی گئی اور اس کا نام ٹیکس یا خراج ہوا۔ اس ٹیکس کی آمدنی کچھ عدالت اور افواج کے اخراجات میں صرف ہوتی تھی اور حسب ضرورت بادشاہ کے صرف میں آتی تھی۔ عوام الناس بادشاہ کی عزت کرتے تھے اور اس کے احکام کی تعمیل لیکن اگر وہ خلاف قانون کوئی حکم کرتا تھا تو سوسائٹی کے ہر فرد کو اس کو متنبہ کرنے کا حق ہوتا تھا۔

جنگ کے موقع پر بادشاہ کی ہر قسم کے اختیارات ہوتے تھے اور امن وصلح کے زمانہ میں اس کی حیثیت دیگر دوسارشہر کی برابر ہوتی تھی باقی سلطنت کا نظم ونسق رعایا کونسل کی صلاح اور مشورے سے انجام پاتا لیکن بادشاہ کا اقتدار

زیادہ ہوتا تھا اور اس کا ادب رعایا پر فرض تھا۔

اس طرح تمدن نے ترقی کرتے کرتے سلطنت قائم کرلی لیکن یہ سلطنت جمہوری سلطنت تھی جس میں بادشاہ یا حاکم کا انتخاب سوسائٹی یا رعایا کی رائے سے ہوتا تھا۔ قیام سلطنت کے بعد ہر فرد مجرم کو سزا دینے کا مستحق نہیں رہا بلکہ وہ عدالت سے سزا دلا سکتا تھا۔

مطلق العنانی یا غیر متمدن حالت میں اگرچہ ہر فرد کے اختیارات وسیع تھے لیکن اس آزادی کا فائدہ مفقود تھا اور اس آزاد زندگی میں کوئی بھی اپنی حفاظت خود نہیں کرسکتا تھا۔ اس وقت نہ تو کوئی قاعدہ، قانون تھا جو سب کے لیے یکساں ہو اور نہ جائز، ناجائز کوئی معیار تھا بلکہ ایک ہی نوعیت کے مقدمات کے فیصلے مختلف طرائق سے ہوتے تھے اور اکثر میں طرفداری اور رعایات مدِ نظر رکھی جاتی تھیں، دوسرے کوئی ایک شخص مسلمہ طور پر منصف نہ تھا بلکہ ہر شخص خود ہی واضع قانون بھی ہوتا تھا اور خود ہی قانون نافذ کرتا تھا۔ اور خود غرضی کی بنا پر انصاف نہ ہو سکتا تھا۔

جب سلطنت جمہوری قائم ہوئی تو اس نے امن عامہ کو قائم کیا۔ قوانین وضع کیے اور ان کے مطابق حکمرانی کی اور سوسائٹی میں نصفت و عدالت قائم کی اور ملک و سوسائٹی کو اندرونی اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھا۔ چونکہ قوانین کے وضع کرنے کا اختیار سوسائٹی کے ہر فرد کو تھا اس لیے اس

میں بھی وہی دقت ہوئی کہ ہر شخص اس کو انجام نہ دے سکا اس لیے کل قوم نے اپنے سربرآوردہ اشخاص کو اپنی طرف سے اس کام کے لیے منتخب کر دیا جو عقل و دانش اور علم و لیاقت میں دوسروں سے ممتاز تھے اور سب نے اس کو تسلیم کر لیا کہ ان کے وضع کردہ قوانین پر ہر شخص عمل پیرا ہوگا اور کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔ اس مجلس کو وضع قوانین یا لیجسلیٹو کونسل کے نام سے موسوم کیا۔ یہ وہ جماعت ہوتی ہے کہ جب اس کو ذی اختیار بنا دیا جاتا ہے تو تمام افراد قوم پر اس کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت فرض ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مقنن کے اختیارات سب سے زیادہ ہوتے ہیں لیکن وہ قانون بنانے میں بالکل خود مختار نہیں ہوتا بلکہ اس کو امور ذیل کا پابند ہونا لازمی ہے۔

اول وہ اس امر کا خیال رکھے کہ وہ ایسے قوانین وضع کرے جن سے قوم و ملک کی حالت درست ہو اور وہ خلاف فطرت نہ ہوں بلکہ ہر ایک میں قوم کی فلاح و بہبودی متصور ہو۔

دوسرے وہ ایسے قوانین منضبط کرے جو ہر شخص کے لیے یکساں حکم رکھتے ہوں۔ افراط و تفریط سے بری اور عدل و انصاف پر مبنی ہو۔

تیسرے ان قوانین میں خلائق کی جان و مال کی حفاظت مدنظر ہو اور ٹیکس یا اخراج کا مقرر کرنا بغیر استفسار رائے قوم بے حد و حساب نہ ہو۔

چوتھے وہ قوانین مستقل ہوں اور جلد جلد ان میں تغیر وتبدل نہو۔

جس شخص کے ہاتھ میں عنان حکومت ہو اس کو خاص خاص ایسے اقتدارات بھی حاصل ہونا چاہئیں جو قانون مروجہ سے برتر ہوں۔ چونکہ بعض اوقات ایسے واقعات پیش آ جاتے ہیں جہاں مقنن کا قانون کوئی ہدایت نہیں کرتا اس وقت چاہیئے کہ وہ اپنی ذاتی رائے سے فیصلہ کرے۔

غرض یہ سلطنت جمہوری ایسی سلطنت ہے کہ نیچرل یا فطری حالت میں جو اقتدارات واختیارات لوگوں کو فرداً فرداً حاصل تھے وہ انہوں نے سوسائٹی کو دیئے اور پھر سوسائٹی نے وہ اپنے حکمران اور اس کے ماتحت چند افراد کو اس شرط پر دیئے کہ وہ ان کی جان ومال، عزت وآبرو کی ہر طرح حفاظت کرے اور ان کی بہبودی اور ترقی پر ہمیشہ کوشاں رہے۔ لیکن اس کو لوگوں کی جان ومال پر خودمختارانہ اختیار حاصل نہیں ہو سکتا۔

جب سوسائٹی تمدنی زندگی کی آخری منزل پر پہنچ جاتی ہے تو اس کے قوانین عدالت کے پیمانے پر ہوتے ہیں اور اس کی گورنمنٹ اپنے تمام افراد کی بھلائی اور بہبودی کے لیے اور تمام سوسائٹی کے انتظام کے خاطر اچھے اصول وضع کرتی ہے اور ان کو مشتہر کرتی ہے تاکہ ان پر کاربند رکھتی ہے۔

وضع قوانین، عدالت وسیاست، نظم ونسق، آئین ملک اور انتظام ایک عمدہ گورنمنٹ کا فرض ہے۔

صلح کل، امن جوئی، معاونت و ہمدردی اور حفاظت تمدن کے معاون ہیں۔ لیکن دشمنی، حسد، زبردستی، جور وظلم، اور خانہ جنگی تمدن میں رخنہ انداز ہوتے ہیں جن سے اجزائے عالم کا مضبوط شیرازہ بکھر جاتا ہے اس لئے گورنمنٹ خرابی کی رخنہ بندی اور مظلوم و مستحقین کی حفاظت کرتی ہے۔

اسلامی تمدّن

تمدن اسلام

تمدنی مسائل پر اس قدر تفصیلی مباحث کے بعد ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ اسلامی دنیا کے تمدن کو پیش کریں اور اس سے یہ ثابت کریں کہ علمائے یورپ کے اعتراضات جو مذہب کے بارے میں طعن و تشنیع سے پُر ہیں کس حد تک درست ہیں تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اسلامی تمدن کس حد تک ان تمام فرائض تمدنی کی تعلیم دیتا ہے اور اس کا متمدن اقوام میں کیا حصہ ہے؟ محاسن اسلام سے صرف وہی اشخاص واقف ہو سکتے ہیں جو تعصبات دینی سے بے لوث ہوں اور جن کی بصیرت کو خداوند تعالیٰ نے نور عرفاں سے روشن کر دیا ہو اور جن کے آسمان ذہانت پر آفتاب علم پرتو فگن ہو ورنہ ان کی نفسانی روشنی طبع کی خیرگی شب جہالت کی تاریکی میں ان کو اس قسم کے محاسن بھی معائب کر دکھائے گی۔

یہ کسی خاص مذہب کی مدح سرائے نہیں ہے بلکہ واقعات زمانہ اور علوم و عقول اس دعوے کی تائید کرتے ہیں کہ مذہب اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو دراصل طبعی کہلائے جانے کا مستحق ہے یہاں تک کہ موجودہ بیسویں صدی میں جو ہر لحاظ سے متمدن اور مہذب سمجھی جاتی ہے اس کے نصوص آفتاب سے زیادہ روشن ہو گئے ہیں اور جس طرح شعاع آفتاب پانی میں سرایت کر جاتی ہیں اسی طرح وہ نصوص عقول انسانی میں نفوذ کر جاتی ہیں۔ کوئی قاعدہ جو تجربات انسانی سے ثابت ہوا ہو اور

کوئی منظر یہ جو حواس خمسہ نے قائم کیا ہو۔ ایسا نہیں پایا جاتا جو انسانی تہذیب اور شائستگی کی ترقی میں موثر ہو اور وہ کسی نص قرآنی یا احادیث نبوی کی صدائے بازگشت نہ ہو۔ اگر ذرا غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمائے روئے زمین جس قدر انسانیت کی شان کی ترقی میں سعی بلیغ اور کوشش ناتمناہی کرتے نظر آتے ہیں ان کا مقصود صرف یہی ہے کہ مذہب اسلام کے قواعد کی صحت اور صداقت پر دلائل و براہین قائم کریں۔

یہ امر تو اظہر من الشمس ہے اور اپنے دعوے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں رکھتا کہ مسلمانوں کے تمدن کی بنیاد جزیرہ عرب میں قائم ہوئی اور بہت ہی قلیل عرصہ میں اس کی شاخیں تمام ممالک مشرقیہ اور مغربیہ میں پھیل گئیں۔ تمدن کا وہ تخم جو اسلام نے عرب کی ادسرزمین میں بویا تھا اور جس کا پودا ابھی نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ ہر چہار طرف سے اس کی بیخ کنی میں انتہائی سعی لاحاصل ہوئی اور بالآخر وہ تمام انسانی مخالفتوں میں روحانی نصرت سے سرسبز ہو کر نخل بارآور ہوا اس کی روشن دلیل ہے کہ یہ ہمیشہ کے لیے ہے اور جب اس کی ملائم اور نازک شاخیں ہی باوجود انتہائی طاقت انسانی جنبش نہ کھا سکیں تو اب یہ تناور درخت چودہ سو سال کا پرورش یافتہ کس صورت سے ہل سکتا ہے۔ یہی وہ شجر بارآور ہے جس کے شیریں ثمرات سے نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ تمام ذی عقل اقوام آج فائز المرام ہو رہی ہیں اور ان اصول تمدن پر کاربند ہو کر مہذب دنیا میں آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہی ہیں اور تمام ان

اقوام کو جنھوں نے ان زرین اصول کو چھوڑ دیا ہے یا ان کی پیروی میں مذہبی تعصبات سے عدم توجہی کی ہے غیر مہذب اور غیر متمدن ہونے کا طعن دے رہی ہیں۔

تواریخ اور علوم تمدن کا استقرار کر کے ہر شخص اس امر پر استدلال کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کا تمدن تمام دنیا کے تمدنوں کی نسبت زیادہ سریع السیر، زیادہ شاندار، عجیب قوی اثر ڈالنے والا اور ہر قسم کے تمدنی صلاح و فلاح کا جامع ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ پر منصفانہ سرسری نظر ڈالنے سے یہ تمام باتیں مجسمہ بنکر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

عربوں کی قبل از اسلام ابتدائی حالت کو غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے طرز معاشرت میں وحشت اور جہالت سے کس قدر قریب تر تھے اور تمدنی فرائض سے محض نا آشنا تھے وہ اپنے اعتقادات باطلہ اور اوہام پرستی میں بھی اپنی دیگر ہم عصر اقوام سے کچھ کم نہ تھے ان میں سے بعض بعث و نشر کے قائل نہ تھے بلکہ اسی دنیوی زندگی کو ابتدا اور انتہا تصور کرتے تھے۔ ارواح بزرگان اور آسمانی فرشتگان ان کے خیال میں ہر کام کی انجام دہی کے لئے مختار کل سمجھے جاتے تھے چنانچہ انہیں کے اصنام اور تصاویر کی وہ پرستش کرتے تھے۔ ہر قبیلہ کا جداگانہ ایک معبود ہوتا تھا جو ان کے تمام دنیوی کاروبار میں دخیل ہوتا تھا اور بوقت ضرورت وہ اس کو اپنا مشیر کار سمجھتے تھے گو بعض قبائل خدا کی عظمت کو بھی مانتے تھے لیکن اصنام کو اس کا نائب جانتے تھے اور فرشتگان خدا کو بعض دختران کو تصور کرتی

تھے۔

شراب خوری۔ قمار بازی اور دیگر معشرتی عیوب ان کے اصل اصول تھے۔ بغض وحسد کینہ وعداوت میں اپنی آپ ہی نظیر تھے۔ ایک قبیلہ کی مخالفت کا سلسلہ دوسرے قبیلہ سے پشتہا پشت تک علی التواتر قائم رہتا تھا اور ایک معمولی سی عداوت میں صدہا خون بہا دیئے جاتے تھے اور پھر بھی صبر نہ آتا تھا۔ اولاد اناث سے ان کو طبعاً نفرت تھی اور ایک باپ اپنی حقیقی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کر دیتا تھا اور اس کے فطری جذبات پدری میں جنبش تک نہ ہوتی تھی۔ درس وتدریس سے ان کے دماغ بالکل کورے تھے گو شاعرانہ تخیلات میں ہر فرد سرشار تھا۔ بزم سے وہ ناواقف تھے لیکن رزم کی ہنگامہ آرائیاں ان کا روزانہ کا پروگرام تھیں اور جدال وقتال ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جو ایام جہالت سے تعبیر کیا جاتا تھا اور اب تک بھی اس نام سے موسوم ہے۔

جب عربستان کے افق پر جہالت و وحشت کا اسقدر ابر محیط چھا رہا تھا اور ظلمت وجہل کی تاریکی میں ہر شخص خود پرستی میں مست نظر آتا تھا۔ اس وقت اسلامی تمدن کا آفتاب مشرق مکہ طلوع ہوا اور اپنی ضیاء عالمتاب سے شب جہالت کی تاریکی کو نور تہذیب و تمدن سے منور و روشن کر دیا۔ آغاز اسلام کا کچھ زمانہ دور قدیم کو عہد جدید سے تبدیل کرنے کی مشکلات میں گذرا اور جن مصائب وآلام کا اس کو سامنا کرنا پڑا وہ بذات خود اسقدر سخت تھے کہ اگر تائید ایزدی شامل حال نہوتی تو

ان کی برداشت طاقت بشری سے باہر تھی ۔

اگرچہ تاریخی انقلابات ہمیشہ سے اپنے ساتھ مصائب و آلام کی سختیاں لاتے ہیں لیکن جن دردناک مصیبتوں میں آغاز اسلام کے گروہ مبتلا ہوئے ان کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ خدا کا ایک شکر گذار بندہ محض اس قصور پر کہ وہ اس نورانی شعاع سے متمتع ہوا ہے عرب کے جلتے ہوئے ریت پر گھسیٹوں گھسیٹا جاتا ہے گرم ترین پتھر اس کے سینہ پر رکھے جاتے ہیں لیکن وہ اس نورانیت سے ظلمت کی طرف رجعت قہقری پر ان جسمانی تکالیف کو ترجیح دیتا ہے اور ان کو نہایت صبر کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو قید کر لیا جاتا ہے اور پھر جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا جاتا ہے اور پھر اس میں سے نکال کر قتل کر دیا جاتا ہے لیکن وہ نہایت استقلال سے اپنے عہد پر قائم رہتے ہیں۔ اور اس قسم کی بہت سی مثالیں اس وقت کی تاریخ کی ورق گردانی سے مل سکتی ہیں جن سے ایام جہالت کے غیر متمدن حالات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے اور اس قوم کے ظالمانہ اور بے رحمانہ سلوک کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تو عرب کی تصویر کا تاریک رخ تھا جو دنیا کے سامنے قبل از اسلام رہا۔ لیکن مذہب کے سرچشمہ سے فیضیاب ہونا تھا کہ یہی وحشی اور جاہل قوم اور یہی غیر مذہب اور ناشائستہ ملک تھوڑے ہی زمانہ میں مکارم اخلاق کا بہترین نمونہ بن گیا اور اس تصویر کا روشن رخ نظر آنا شروع ہو گیا یہی وہ قوم تھی جس میں صرف مذہب کی بدولت آگے چل کر ہم کو ایسے لوگ نظر آئینگے جن کے اخلاق حمیدہ اور صداقت پسندیدہ [illegible] جیسا کہ مشہور ہیں [illegible]

حکمت کے خاندانوں میں تربیت پائی ہے ہم کو عظمت وشہامت، فضائل وکمالات کے ایسے نمونے نظر آئیں گے جو اپنے آپ ہی نمونہ ہیں۔ ہم کو زہد واتقا وورع وپرہیزگاری کی ایسی نظیریں ملیں گی جو حکمائے اخلاق کو ان کی تصنیفات وتالیفات کے بین نقائص سے آگاہ کرتی ہیں۔ اب اس موازنہ کے بعد بقول بعض فلاسفران یورپ یہ کہنا کہ تمدن سبب ہے اور مذہب اس کا نتیجہ کہاں تک درست ہوسکتا ہے۔ ہر شخص بلا تامل کہہ سکتا ہے کہ انسانی تمدنی رفتار روز افزوں ترقی کی طرف مائل ہے اور اقوام کی عروج وزوال میں ان کا مذہب بہت کچھ دخیل ثابت ہوا ہے اور متعدد حیثیوں سے ان کا تمدن ان کے مذہب سے وابستہ رہا ہے یہ صرف مذہب کا کام تھا جس نے قوم عرب کو پستی اور حضیض نکبت سے نکال کر مدارج اعلیٰ پر پہنچا دیا۔

بعض ملحدین اس کے قائل ہیں کہ مذہب سرے سے کوئی چیز ہی نہیں ہے یہ محض ایک ڈھکوسلا ہے۔ درآنحالیکہ قدیم ترین تواریخ بھی اس پر شاہد ہیں کہ جاہل سے جاہل قوموں میں بھی مذہب کوئی چیز ضرور رہی ہے اس لفظ کا استعمال مرور ایام سے اس وقت تک پایا جاتا ہے۔ تمام اقوام خواہ وہ مہذب ہوں یا وحشی اس کے نام سے بخوبی واقف ہیں لیکن مختلف اقوام نے اپنے اپنے ادراک اور فہم کے مطابق اس کو نئے نئے جامے پہنائے ہیں اور اس لفظ کے مختلف معنی سمجھے ہیں۔ قدیم ترین زبانوں میں مذہب کے معنی بالکل مختلف تھے وہ لوگوں معبودوں کی رضا جوئی اور ان کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے حیوانوں اور انسانوں کی

قربانی تک جائز رکھتے تھے اور صرف یہی انکا مذہب تھا لیکن جیسے جیسے انسانی عقول میں علوم وفنون سے نشو و نما ہوتی گئی ویسے مذہب کے اصل معنی ان کی سمجھ میں آتے گئے۔ اور اس لفظ کا مفہوم بالآخران معنوں کے قریب تک پہنچ گیا جو کہ آسمانی مذاہب کا حکم ہے اور خود علمائے یورپ علمی فتنوں میں مبتلا ہو کر انہیں اصول کے قریب قریب پہنچ گئے ہیں جتنے وہ بعید تر تھے اور عبادات جسمانی اور روحانی کے وہ لوگ اب قائل نظر آتے ہیں چنانچہ اس کا ایک مشہور فلاسفر چارلس سیمون لکھتا ہے کہ "ہم اس زندگی میں ان فرائض کی انجام دہی کرتے ہیں جو خدائے تعالیٰ نے ہمارے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔ اور جب ہماری زندگی ختم ہو جائے گی تو جزا اور سزا اور عذاب و ثواب کا خدا کو اختیار ہے" آگے چل کر اعتقاد کے بارے میں وہی لکھتا ہے کہ "جو چیز انسان کے لیے باعثِ ثواب ہوسکتی ہے وہ اپنی خاص قوتوں کی اطاعت اور کارِ خیر کی انجام دہی ہے۔ یہ قانون انسانی ہے کہ وہ اپنی ذات کی حفاظت کرے اور ان قوتوں کو ترقی دینے کی کوشش کرتا رہے جو اس میں ودیعت کی گئی ہیں۔ اپنے بھائیوں سے محبت کرے اور مخلوقِ خدا کی خدمت کرے خالق کے ساتھ محبت کرے اور اس کی عبادت کرے لیکن وہ کیا طریقہ ہے جس کے مطابق انسان کو خالق کی عبادت کرنا چاہیئے؟ وہ دراصل ادائے فرائض ہے۔ اور کارِ خیر عین عبادت ہے۔ محبت اور اخلاص عین نماز ہے حب الوطنی خدا کی عبادت میں سے ہے۔ ہم کو ایسے خالق کے وجود کا اعتقاد رکھنا چاہیئے جو ہر چیز پر قادر ہے

اور جس کو کوئی چیز متغیر نہیں کر سکتی۔ اسی نے تمام عالم کو پیدا کیا ہے اور قوانین فطرت اس پر فرض کرتے ہیں اس دنیوی زندگی کے بعد ایک آخروی زندگی ہوگی جس میں انسان کو اپنی نیکیوں اور بدیوں کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے اور یہی ہماری نماز ہے کہ ہمارا دل خدا کی محبت اور نیز انسان کی محبت سے لبریز ہو اور فرائض کی انجام دہی میں ہمارا ارادہ مستحکم ہو اور بھلائی اور خیرات کرنے میں ہم خدا کی مرضی کے تابع رہیں۔"

یہ ہیں وہ خیالات اور اعتقادات جو اس گروہ میں سے ایک فرد کے ہیں جن کی تحریرات مذہب کے بارے میں طعن و تشنیع سے پُر نظر آتی ہیں اور جو مذاہب کو فنا ہونے کی دھمکی دیتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بعض الفاظ اس آیۃ کریمہ کی پوری پوری تفسیر ہیں کہ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ اور بعض الفاظ مسلم اعتقادات کے بالکل موافق نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف اعتقادات میں ہی بلکہ عبادات میں بھی کسی حد تک قائل نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس گروہ کا ایک مشہور فلاسفر علامہ ہیوم (Hume) ایک مقام پر اس طرح رقمطراز ہے کہ "خارجی عبادت صرف اس وقت ناپسندیدہ ہوتی ہے جبکہ وہ مقصود بالذات ہو۔ لیکن اگر وہ انسانی نفس کے احساسات شریفانہ کو بیدار کرنے اور ان کو تقویت دینے کا ذریعہ ہو تو اس کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔"

یہاں پر نامناسب نہ ہوگا اگر ہم چند غیر مسلم اقوام کے مشہور لوگوں کے اقوال جو

قرآن مجید کے متعلق تحریراً یا تقریراً بیان کئے گئے ہیں بیان کر دیں۔ چنانچہ فرانس کا ڈاکٹر مورلیس لکھتا ہے کہ قرآن شریف کی سب سے بڑی تعریف اس کی فصاحت و بلاغت ہے۔ مقاصد کی خوبی اور مطالب کی خوش اسلوبی کے اعتبار سے قرآن کو تمام آسمانی کتابوں پر فوقیت ہے۔ مسٹر لڈلف کرہل کرھاحب لکھتے ہیں کہ قرآن میں عقائد و اخلاق کا مکمل ضابطہ و قانون موجود ہے۔ وسیع جمہوریت۔ رُشد و ہدایت۔ انصاف و عدالت فوجی تنظیم و تربیت اور مالیات اور غربا کی حمایت و ترقی کے اعلیٰ آئین موجود ہیں۔ جارج سیل صاحب جو متعصب مترجم قرآن ہیں لکھتے ہیں کہ قرآن شریف بے شبہ عربی زبان کی سب سے بہتر اور سب سے مستند کتاب ہے۔ کسی انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا اور یہ مردوں کو زندہ کرنے سے زیادہ معجزہ ہے۔ ریورینڈ آر میکسوئل کنگ اپنی تقریر دین اسلام میں کہتے ہیں کہ قرآن الہامات کا مجموعہ ہے۔ اس میں اسلام کے اصول و قوانین اور اخلاق کی تعلیم اور روزمرہ کے کام کے متعلق ہدایات ہیں۔ اس لحاظ سے اسلام کو عیسائیت پر فوقیت ہے کہ اس کی مذہبی تعلیم اور قانون علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ موسیو اوجین کلافل نامور فرانسیسی لکھتے ہیں کہ قرآن مذہبی قواعد اور احکام ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں سوشل احکام بھی موجود ہیں جو انسان کی زندگی کے لیئے ہر حالت میں مفید ہیں۔ پروفیسر کارلائل صاحب لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک قرآن شریف میں خلوص اور مسیحائی کا وصف ہر پہلو سے موجود ہے اور سچ یہ ہے کہ اگر کوئی خوبی پیدا ہو سکتی ہے تو اسی سے ہو سکتی ہے۔ کاؤنٹ ہینری

دی کاسٹری اپنی کتاب الاسلام میں لکھتے ہیں کہ قرآن کو دیکھ کر عقل حیرت میں ہے کہ اس قسم کا کلام اس شخص کی زبان سے کیونکر ادا ہوا جو بالکل امی تھا۔ نامور مورخ ڈاکٹر گبن لکھتے ہیں کہ قرآن وحدانیت کا بڑا گواہ ہے ایک موحد فلسفی اگر کوئی مذہب قبول کر سکتا ہے تو وہ اسلام ہی ہے غرض تمام جہان میں قرآن کی نظیر نہیں مل سکتی۔ موسیو سیدیو ایک مشہور فرانسیسی مصنف لکھتے ہیں "کہ اسلام کو جو لوگ وحشیانہ مذہب کہتے ہیں انہوں نے قرآن کی تعلیم کو نہیں دیکھا ہے جس کے اثر سے عربوں کی تمام بری اور معیوب عادتوں کی کایا پلٹ ہو گئی"۔ موسیو کارسٹن کار نے اخبار فگارو میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر زمین سے قرآن کی حکومت جاتی رہے تو دنیا کا امن و امان کبھی قائم نہیں رہ سکے گا۔ ایکم دی بولف صاحب ایک جرمن ڈاکٹر لکھتے ہیں کہ قرآن نے صفائی۔ طہارت اور پاکبازی کی ایسی تعلیم دی کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو بیماریوں کے کیڑے سب کے سب ہلاک ہو جائیں چیمبرس انسائیکلوپیڈیا میں محمد نیزم کے زیر عنوان لکھا ہے کہ قرآن نے ظلم۔ جھوٹ۔ غرور انتقام۔ غیبت۔ طمع۔ فضول خرچی۔ حرام کاری۔ خیانت و بدگمانی کی بہت سخت برائی کی ہے اور یہی اس کی بڑی خوبی ہے سر ولیم میور صاحب جیسے متعصب انگریز نے لکھا ہے کہ قرآن نے فطرت اور کائنات کی دلیلوں سے خدا کو سب سے اعلیٰ ہستی ثابت کیا اور انسانوں کو خدا کی اطاعت اور شکر گذاری پر جھکا دیا۔ مسٹر عمانوئیل ڈی الش لکھتے ہیں کہ "قرآن کی روشنی یورپ میں نمودار ہوئی جبکہ تاریکی محیط ہو رہی تھی اور اس سے

یونان کی مردہ عقل اور علم کو زندگی مل گئی۔" مسٹر سروجنی نیڈو نے اپنی تقریر میں لندن میں کہا کہ قرآن شریف غیر مسلموں سے بے تعصبی اور رواداری سکھاتا ہے دنیا اس کے اصول کی پیروی سے خوش حال ہو سکتی ہے۔"

مسٹر ایچ ایس۔ لیڈر نے اپنے لیکچر میں ایک موقع پر کہا تھا کہ تعلیم قرآن سے فلسفہ و حکمت کا ظہور ہوا اور ایسی ترقی کی کہ اپنے عہد کی بڑی سے بڑی یورپین سلطنت کی تعلیم حکمت سے بڑھ گیا۔ مسٹر ای ڈی مارسل نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام کی قوت و طاقت قرآن میں ہے۔ قرآن قانون اساسی ہے اور حقوق کی دستاویز ہے۔ ایک مشہور جرمنی فلاسفر جان جاک لیسک لکھتا ہے کہ جب منکر پیغمبر کی زبان سے قرآن سنتے تھے تو بیتاب ہو کر سجدے میں گر پڑتے تھے اور مسلمان ہو جاتے تھے۔ ایچ۔ جی ویلز ایک مشہور افسانہ نویس لکھتے ہیں کہ قرآن نے مسلمانوں کو مواخات کی بندھن میں باندھ رکھا ہے جو نسل رنگ اور زبانوں کے فرق کی پابند نہیں ہے۔" میجر لیونارڈ لکھتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم بہترین ہے اور انسانی دماغوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ لندن کا اخبار نیر ایسٹ (Near East) لکھتا ہے کہ اگر ہم قرآن کی عظمت و فضیلت اور حسن و خوبی سے انکار کریں تو ہم عقل و دانش سے بیگانہ ہونگے۔ سر ایڈورڈ ڈینس سی آئی ای لکھتے ہیں کہ قرآن شریف اس کا مستحق ہے کہ یورپ کے گوشہ گوشہ میں پڑھا جائے۔

اکثر یہ اعتقادات مذہب اسلام کے آفتاب کی ایک نامعلوم شعاع اور اس

کے بحر ذخار کا ایک اقل قلیل قطرہ ہیں لیکن اس نظریہ کی ضرور تائید کرتے ہیں کہ حقایق کے ادراک میں دنیا جسقدر ترقی کرتی جائیگی۔ اسی قدر اس پر رموز مذہب اسلام کھلتے جائیں گے۔ اور اسلام کے اصول سے قریب تر ہوتی جائیگی۔

ہر وہ شخص جو تواریخ اقوام پہ تدبیر و فکر کے ساتھ غور کریگا۔ اور ان کے مندرجہ واقعات کو بغور مطالعہ کریگا اس کو معلوم ہو جائیگا کہ تمام وہ اقوام جو زمانہ سلف میں مہذب اور متمدن طبقوں میں شمار کی جاتی تھیں۔ وہ دراصل کسقدر تمدن کے اصول سے دور تھیں۔ اس کو ایسے خوفناک اور دردانگیز حادثات نظر آئینگے جن سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسکو بے شمار خوں ریز لڑائیوں تمدنی فتنہ و فساد۔ خاندانی مصائب و آلام اور اخلاق ذمیمہ کا صحیح اندازہ ہو جائیگا۔ ان اقوام نے دیگر ابنائے جنس کو وہ نا قابل تلافی نقصان عظیم پہنچائے ہیں جن کی مثال ملنا مشکل ہے اس کے استدلال میں ہم صرف دو عظیم الشان سلطنتوں کو پیش کرتے ہیں جو آغاز اسلام کے زمانہ میں تمدن کے بہترین طبقہ میں شمار کیجاتی تھیں اور دنیا کی دوسری قومیں ان کی شوکت وسطوت سے لرزتی تھیں ان کے حالات ایک غیر شخص کے الفاظ میں اس طرح درج ہیں گویا کہ وہ ایک مورخانہ حیثیت سے ان کے اخلاق و طرز معاشرت کا خاکہ کھینچتا ہے چنانچہ علامہ لاروس لکھتا ہے کہ رومانیوں کے نظام سلطنت کیا تھے ؟ وہ نظامات بالکل وحشت اور سراسر فسادات تھے جو قوانین کی صورت میں نافذ تھے۔ روما کے اخلاقی خصائل مثلاً شجاعت ۔

فکر و تدبر دور اندیشی اور قومی اخلاص بعینہٖ ایسے تھے جو چوروں اور رہزنوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی طینت وحشت کا لباس پہنے ہوئے تھی جس میں سوائے حرص و طمع اور افراد غیر کے ساتھ عداوت اور حسد کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ انسانی شفقت اور انسیت کی حالت زبوں تھی۔ روما کی عظمت اور فضیلت میں وہ اعمال تھے جو بذریعہ تازیانہ اور تلوار کے انجام دیئے جاتے تھے اسیران جنگ کو عذاب اور قید کے احکامات صادر کیے جاتے تھے۔ بچوں اور بڈھوں سے فتح و نصرت کی گاڑیاں کھنچوائی جاتی تھیں ...... " یہ روئے زمین کی سب سے عظیم الشان قوم کی تمدنی ترقی تھی جس پر علمائے سلف کو فخر ہے۔ جہاں ایک طرف فاتحان قوم اپنے مفتوح افراد کو فاتحانہ جذبات سے موثر ہو کر اپنی گاڑیاں کھنچوانے کی سزا دیتے نظر آتے ہیں وہاں دوسری طرف فتح مکہ میں فاتح اعظم اپنے ان تمام جانی دشمنوں کو جن کے نتیجۂ ظلم سے جسمانی اور روحانی سخت ترین تکالیف اٹھائے زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا۔ بشارت صلح و امن، دیتا نظر آتا ہے۔ اور اپنے اخلاق کریمانہ اور تمدن اسلامی کا ان الفاظ میں نمونہ پیش کرتا ہے کہ "جو شخص ہتیار ڈالدیگا یا ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائیگا یا جو مسجد حرم میں داخل ہو جائیگا اس کو امن دیدی جائیگی۔" یہ وہ وقت تھا جبکہ اسلام فتح و نصرت کا تاج سر پر رکھے ہوئے اس شہر میں داخل ہوا تھا جہاں وہ کچھ ہی زمانہ پہلے دردناک مصائب کا شکار تھا اور وہ بھی اس شان و شوکت کیساتھ کہ مخالفین تاب مقاومت نہ لاسکے اور سب نے

عاجز ہو کر ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اگر فاتح چاہتا تو اپنے دشمنوں کو تہ تیغ کر دیتا۔ سخت سے سخت ایذا میں وہ لوگ مبتلا کئے جا سکتے تھے لیکن وہاں نفسانی جذبات اور انتقامی احساسات کی بجائے انسانی ہمدردی اور تمدنی حسن سلوک کا مجسمہ کارفرما تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مقام ذی طوی میں پہنچے تو سب سے پہلے جو کام کیا وہ سجدہ شکر تھا۔ چنانچہ سر بسجود ہو کر درگاہ الٰہی میں فرمایا کہ "ایک وہ وقت تھا جبکہ میں پوشیدہ طور پر اپنی جان بچا کر بھاگا تھا اسی سے دو سال قبل عمرہ کرنے آیا لیکن مخالفین نے داخل ہونے دیا تھا یا اب یہ وقت ہے کہ میں صرف تیری قدرت کاملہ سے اسقدر شان و شوکت اور عزت و حشمت کے ساتھ اس شہر میں پھر فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوتا ہوں،، اس موقع پر قابل غور یہ امر ہے کہ باوجود فتح و نصرت سب سے پہلے جو کام ہادی اسلام نے کیا وہ اس خدائے عزوجل کا شکر تھا جس کی بدولت یہ فتح حاصل ہوئی تھی۔ اور ایسے وقت میں بھی انہوں نے یاد الٰہی کو مقدم خیال فرمایا۔ جب مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو یہ شان تھی کہ سب سے پہلے چار سو بنی غفار تھے۔ پھر ایک ہزار تین سو قبیلہ مزینہ کے سوار اور سات سو اسلم کے سوار۔ ایک ہزار چار سو خاندان جہینہ کے اور ایک کثیر تعداد قبیلہ تمیم قیس اور اسد کے لوگوں کی علم نصرت بلند کئے تکبیر و تہلیل کہتے ہوئے تھے۔ سب سے بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو اسی جماعت کے ساتھ تھے جنکا تمام لباس سبز تھا اور وہ سب کے سب لباس جنگ سے مزین تھے۔ اس شان و شوکت کو دیکھ کر ابوسفیان

نے حضرت عباس سے کہا کہ اب تو میرا بھتیجہ بادشاہ ہو گیا ہے لیکن انہوں نے جواب دیا کہ یہ شان بادشاہت نہیں ہے بلکہ یہ شان نبوت ہے جب ہر طرح اسلام کا تسلط ہو گیا تو آپ نے مفتوح قوم سے دریافت فرمایا کہ "تم کو میری بابت کیا خیال ہے؟ یعنی میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرونگا"؟ سب آپ کے اخلاق حمیدہ سے بخوبی واقف تھے گو ان کو اپنے جرائم کا بخوبی اندازہ تھا لیکن سب نے یہ عرض کیا کہ آپ خود کریم ابن کریم ہیں ۔ یہ الفاظ سُنکر آپ نے فرمایا کہ "جاؤ میں نے سب کو آزاد کر دیا اور سب کی جاں بخشی کر دی" یہ تھا وہ خلق جس کی بدولت اسلام میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوتی گئی ۔ کیا دنیا کی کوئی تاریخ ایسی نظیر پیش کر سکتی ہے؟ کیا دنیا کی متمدن سے متمدن اقوام میں سے کوئی قوم بھی یہ برتاؤ کر سکتی تھی جو نبی کریم نے اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ کیا؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں ۔ تمام وہ صحابی جن کے اعزا و اقارب کفار مکہ کے ہاتھوں عذاب میں مبتلا ہوئے تھے یا قتل کیے گئے اب برسر اقتدار تھے اور جائز طور پر بخوبی بدلہ لے سکتے تھے لیکن مذہبی اخلاق نے ان کو وہ تعلیم دی تھی جس کا عملی نمونہ انہوں نے اس موقع پر پیش کر دیا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ فمن عفی لہ من اخیہ شئ فاتباعٌ بالمعروف واداءٌ الیہ باحسان پر کس طرح عامل ہوتے ہیں ۔

تمام وہ گروہ انسانی جو اس مسکونہ کرۂ ارض پر زیست سہ گانہ کے جز رو مد میں مصروف نظر آتے ہیں ان کی حالات زندگی پر ایک سطحی نظر یہ ثابت کر دیتی ہے کہ

کہ اس زندگی کے جدال وقتال میں وہی قوم سب سے زیادہ فائز المرام ہوگی جن کی اجتماعی قوت ان افراد سے وابستہ ہوگی جو اپنی ذاتی محنت وسعی اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں مشغول رہتے ہیں اور سستی اور کاہلی سے نفرت کرتے ہیں۔

اس اصول پر یہ کہنا کہ محنت وکوشش منجملہ ان اصول کے ہیں جو نوع انسانی کی افراد کو متمدن اور مہذب بناتے ہیں بالکل درست ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ علامہ ڈیریرش اور اس کے ہم خیال دیگر فلسفی مذاہب پر لعن وطعن کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ چیز جو انسانی ہستی کو کاہلی اور سستی کی طرف آمادہ کرتی ہے اور بالآخر اسکو قعر مذلت میں گرا کر چھوڑتی ہے وہ صرف مذہب ہے۔

فلاسفران مذکور کو دراصل ان اصول اسلامی کا علم نہیں ہے جو فی الحقیقت مذہب کی حیثیت سے انسان کو کاہلی اور تساہل سے نکالنے اور اس کو پابندی وقت کیساتھ تمام اپنے کاروبار زندگی میں تا عمر طبعی منہمک رہنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ مذہب اسلام نہ تو ایسے تقشف کی پابندی لازم کرتا ہے جس سے نفس انسانی تمام خواہشات اور رغبتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے اور نہ وہ اس قسم کے احکام نافذ کرتا ہے جو تمدنی صلاح وفلاح کے مانع ہوں اور معیشت کو اسقدر تنگ کر دیں کہ اخلاقی تہذیب تک ناممکن ہوجائے بلکہ وہ معاشرتی۔ تعاونی اور تعاملی زندگی کو بہترین اصول کے ساتھ بسر کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ چنانچہ

اصلاح معیشت کی تعلیم حدیث نبوی کے ان الفاظ سے بخوبی ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے اپنی معیشت کی اصلاح کرنا ایک دانشمندانہ کام ہے اور جن امور سے تمہاری اصلاح ہوتی ہے ان کی جستجو کرنا حُب دُنیا نہیں ہے"، ہم کو آغاز اسلام کے گروہ میں ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں جنہوں نے ان اصول پر عمل درآمد کیا اور جو اپنی معیشت کے لیئے اسلامی نقطہ نظر سے صنعت و حرفت یا کسب حلال کو اختیار کرنا اپنا فخر سمجھتے تھے اور وہ دنیوی عقول کے ساتھ دین میں بھی ہمیشہ کامل ہوتے ہیں چنانچہ یہ تاریخی واقعہ مشہور ہے کہ جس وقت ہرقل بادشاہ روم نے سفیر اسلام سے حضرت عمرؓ کی بابتہ سوال کیا تھا کہ وہ کیسے شخص ہیں تو اس نے جواب دیا کہ لَا یَخْدَعُ وَلَا یُخْدَعُ یعنی نہ وہ خود کسی کو دھوکہ فریب دیتے ہیں اور نہ ان کو ہی کوئی شخص دھوکہ دیسکتا ہے ۔ ہرقل نے کہا کہ اگر وہ ایسے ہیں تو ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا کہ جس میں دین اور عقل دونوں جمع ہوں اس کی قوت کا مقابلہ ممکن نہیں ہوتا ۔

قوت عمل کے متعلق ہم کو اسلامی تاریخ وضح طور پر بتاتی ہے کہ تقریبًا تمام صحابہ کرام تجارت پیشہ تھے اور اکثر ائمہ دین بکریاں اور اُونٹ چرا کر اپنی روزی پیدا کرتے تھے تواریخ کی ورق گردانی اس کو صاف ظاہر کر دیتی ہے کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے معززین بری اور بحری تجارتوں میں مصروف تھے اور اپنے باغوں میں اپنے ہاتھ سے کاروبار کرتے تھے ۔ علمائے سلف میں جن حضرات نے اپنی معاش قوت بازو سے حاصل کی ہے ان کا رجحان خاطر بھی اکثر اسی مقدس

پیشہ کی طرف رہا ہے۔

چنانچہ حضرت سالم بن عبداللہ۔ حضرت سماکؒ بازار میں لین دین کا کام کیا کرتے تھے۔ امام یونس بن عبید داؤد ابو ہند اور امام ابو حنیفہ کی ریشمین کپڑوں کی تجارت تھی۔ امام ابن جوزی تانبا فروخت کرتے تھے اور حافظ حدیث ابن رومیہ عطار کی دوکان رکھتے تھے۔ ابو یعقوب لکڑی کا کام کرتے تھے اور محمد بن سلمان کا ذریعہ معاش گھوڑوں کی خرید و فروخت تھی۔ بعض وہ بزرگانِ دین تھے جو صرف حرفت کو اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوئے تھے۔ منجملہ ان کے ابو الفضل ھندس دمشقی مشہور طبیب بڑھئی کا کام کرتے تھے اور اپنے فن میں ماہر تھے چنانچہ شفا خانہ شاہی کے دروازے اکثر ان ہی کے ہاتھ کے بنے ہوئے تھے۔ جامع مسجد دمشق کی گھڑیوں کی مرمت انہیں کے ذمہ تھی جس کی بابت ان کو تنخواہ ملتی تھی۔ ابن طاہر امام ابو سعید نحوی۔ ابن الہیثم۔ طبیب نامور اور امام ابن الخاصبہ اپنے دست و بازو سے روٹی کماتے تھے اور اجرت پہ کتابت کرتے تھے۔ امام ابو سعید نحوی باوجود عہدہ قضا پر مامور ہونے کے اپنا گذر صرف کتابت پر کرتے تھے۔ صرف دس ورق یومیہ لکھا کرتے تھے اور ان کی ہی اجرت پر قناعت کرتے تھے۔

ابن الہیثم جو فن طب میں کامل تھے اور بہت معزز عہدہ پر سرفراز تھے ایک سال میں صرف تین کتابیں مجسطی۔ متوسطات۔ اور اقلیدس لکھا کرتے تھے جس کی اجرت ان کو ڈیڑھ سو اشرفی ملتی تھیں۔ اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ یہ چند

مثالیں تو اس زمانہ کی ہیں جبکہ اسلامی تمدن اسلامی تہذیب و شائستگی اور اس کے قوانین وضوابط کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ لیکن اس قسم کی مثالیں ہر زمانہ میں ملتی چلی آئی ہیں۔ چنانچہ اس آخری دور میں جو پستی کی حالت میں تھا ہندوستان میں ہم کو عالمگیر اورنگ زیب کی سوانح ان واقعات سے پُر نظر آتی ہیں۔ ایسا زبردست بادشاہ جس کے دبدبہ شاہی سے تمام ریاستیں لرزتی تھیں اور جس کے قبضہ و قدرت میں تمام شاہان مغلیہ کا ذخیرہ تھا۔ اپنی معاش کتابت قرآن سے مہیا کرتا تھا۔ کیا باوجود اسقدر صریح تاریخی واقعات کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب اسلام کاہلی اور سستی کی طرف رغبت دلاتا ہے۔

اسلام نہ صرف دنیوی کاموں کی طرف رغبت دلاتا ہے بلکہ وہ اخروی کاموں کے لیے بھی یکساں تحریص دلاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت نے فرمایا کہ "تم دنیا کے کام اس طرح کرو گویا کہ تم ہمیشہ زندہ رہو گے اور آخرت کے کام اس طرح انجام دو گویا کہ تم کل ہی مر جاؤ گے"۔ کیا ان احکام سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ دنیوی کاروبار عین مرضی خدا ہے؟ دنیا و مافیہا سے دست بردار ہو کر ہمہ تن ریاضت و عبادات میں مصروف ہو جانے کا نام دین یا مذہب نہیں ہے جن اقوام نے دین نافہمی سے صرف عبادت الٰہی کو اپنا مقصد قرار دیدیا ہے اور راہبانہ زندگی بسر کرنے لگے وہ پورے طور پر مذہب کے پابند نہ رہ سکے چونکہ بنی نوع انسان کے قیام کا انحصار بھی تنازع البقا پر ہے جس کو struggle

far Excis tance کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جو قوم
اس دنیوی کاروبار میں دیگر ہم عصر اقوام سے اپنے حقوق کے حصول میں پیچھے
رہجائیگی۔ اس اصول پر ایک نہ ایک روز ضرور فنا ہو جائے گی اور دوسروں
کے لیے عبرت آموز سبق ہوجائیگی ورنہ اس کے ذلیل اور پست ہونے میں تو کوئی
شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔

مذہب اسلام چونکہ انسانی ترقی کا آخری دور ہے اس لئے اس نے
انسان کی جسمانی۔ اخلاقی اور روحانی ترقیات کے اصول کامل طور پر بتائے
ہیں۔ انسان اگر ذرا غور و تامل سے کام لے تو معلوم ہوگا کہ وہ نہ تو صرف اس
دنیوی معیشت اور یہاں کے آرام و آسایش کے لیے ہی پیدا کیا گیا اور نہ وہ
آخرت کے کام دنیا میں زیست سہ گانہ راحت کے ساتھ بسر کئے بغیر پورے
طور پر انجام دیسکتا ہے گویا بالفاظ دیگر غایت تخلیق اشرف المخلوقات نہ تو محض
دنیوی تعیش ہے اور نہ صرف اُخروی تقشف بلکہ تدین اور اسلامی اصول پر
پورے طور پر کاربند ہو کر تنازع البقا کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے زاد آخرت
جمع کرنے کا نام ہے۔ چونکہ زیست سہ گانہ کی ضرورت انسان کو کسب دولت پر
مجبور کرتی ہے اور وہ بھی اس ضرورت سے کہ اوس نے نوع انسان کو افضل ترین
عبادت بنایا ہے اور یہ امر ارشادات نبوی کے ان الفاظ سے واضح ہے کہ
"تمام اعمال میں افضل کسب حلال ہے" اور نیز یہ کہ "حلال مال کا طلب کرنا

ہر مسلم پر فرض ہے" یہ اور اس مضمون کی بہت سی احادیث ہیں جن سے کسب مال کی تاکید ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ خلفائے راشدین اور ائمہ دین کے واقعات بھی اس کو بین طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ یہ حضرات سب کسب مال حلال طور پر اپنے دست و بازو سے پیدا کرتے تھے جیسا کہ امثال متذکرۂ بالا سے معلوم ہوا ہوگا۔

توکل

اس ضمن میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مختصر بحث توکل کے متعلق بیان کر دیجائے تاکہ ان لوگوں کو جو ؎

"گفت پیغمبر با آواز بلند
بر توکل زانوئے اشتر بہ بند"

کے معنی و مطلب کو غلط سمجھ کر مذہب کے نام سے تساہل اور کاہلی میں گرفتار ہو کر خود بھی تباہ ہوتے ہیں اور مذہب کو بھی بدنام کرتے ہیں واضح ہو جائے کہ اس کا مفہوم اصلی کیا ہے۔ توکل علی اللہ کے معنی تدابیر دنیوی سے روگردانی اور محض بخت و اتفاق کی امید موہوم کا انتظار کرنا نہیں ہیں اور نہ یہ کسی نص قرآنی یا حدیث نبوی سے ثابت ہے بلکہ ہر متنفس پر یہ فرض ہے کہ وہ کسب دولت یا کسی چیز کے حصول کے لیے تمام جائز طرائق دنیوی اختیار کرے اور حتی المقدور اس میں سعی بلیغ کرے اس کے بعد نتائج کو خداوند قدیر کی سپرد کر دے۔ اس وقت وہ یہ کہنے کا مستحق ہوگا کہ ؎

ما کار خویش را بخداوند کارساز بسپردہ ایم تا کرم او چہا کند

لیکن اگر محض تقدیر کے خیال پر دنیوی تدبیر ترک کردی جائے اور محض کاہلی اور سستی کو توکل کا مرادف تصور کر لیا جائے تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص تشنہ لب کسی کنویں پر محض اس امید پر خاموش جا بیٹھے کہ اس میں کا پانی خود بخود اُڑ کر اس کی پیاس بجھا دیگا۔ اگر بالفرض کوئی راہگیر اپنے ذاتی قیافہ و قیاس کو کام میں لاکر اس کی تمام تدابیر خود انجام دے کر اس کو پانی پلا بھی دے تو بھی اس کے معنی توکل کے ہرگز نہیں ہو سکتے بلکہ اس کو محض اتفاق سے تعبیر کیا جائے گا۔ بعض گروہ علما اس بخت و اتفاق کی بنا پر یہ سلسلہ رہبانیت توکل کو جائز قرار دیتے ہیں اور مذہب اسلام کو دوسرے مذاہب کے لیے ہدف ملامت بناتے ہیں۔ یہ دراصل ان کی غلطی ہے جو مذہب کو ایسا خیال کرتے ہیں۔ مذہب تو صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ ہر معاملہ میں خواہ وہ دنیوی ہو یا اُخروی ہمت اور پیش قدمی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے اور کاہلی اور گمنامی محرومی اور فقر و فاقہ کا سبب ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر حدیث شریف میں وارد ہے کہ "دلیر تاجر کو رزق ملتا ہے اور کاہل تاجر محروم رہتا ہے" اور بدیہی بھی یہی امر معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص کسبِ رزق کے لیے مقررہ اصول فطرۃ کے مطابق عمل درآمد نہ کریگا وہ اس کے حصول کا مستحق ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خود قرآن مجید میں آیا ہے کہ "وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا" یعنی خداوند تعالےٰ کے تمام امور ایک طریقہ مقررہ کے اصول پر منضبط ہیں اور کبھی ان کے خلاف ہونا نہیں پایا جاتا۔

قناعت اسی طرح قناعت کے بارے میں غلطی کی جاتی ہے دراصل قناعت یہ ہے کہ ہماری محنت اور وسائل سے جس قدر ہم کو مل سکے اسی پر اکتفا کریں اور ناجائز وسائل سے دوسرے لوگوں کے حقوق کے حصول کی کوشش نہ کریں۔ نہ یہ کہ جو ہماری محنت اور سعی کے صلہ میں ہم کو ملے اسے بھی چھوڑ دیں اور آمدنی کے جائز وسائل سے متمتع نہ ہوں یا صحت اور فرصت کے لحاظ سے محنت اور وقت اکتساب کمال میں صرف نہ کریں یہ نہ قناعت ہے اور نہ پرہیزگاری کہ باوجود قدرت اور جواز کے کوئی شخص اکتساب معاش میں غفلت کرے اور اپنے آپ کو یا اپنے عزیز و اقارب کو تکلیف میں مبتلا کرے یا دوسروں کی خیرات پر گذارہ کرے۔ اگر وہ کثیر دولت سے مستغنی ہے اور اس کے مایحتاج سے زیادہ اس کے پاس موجود ہے تو بھی اکتساب سے باز نہیں رہنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں جب ذاتی ضروریات سے زیادہ ہوتا ہے تو رفاہِ عام اور خیر خواہی خلائق کے کام کر سکتا ہے۔ اپنے ابنائے جنس اور اپنی قوم کو فائدہ پہنچا سکتا ہے جس سے وہ عنداللہ ماجور اور عندالناس مشکور ہوگا۔

یہ ہیں وہ مذہبی اصول جن کی نسبت مشاہیر علما اور فلاسفران الہیات یہ رائے رکھتے ہیں کہ مذہب اس کا نام ہے کہ تم سیاسی زندگی کو خیرباد کہو اور تمام دنیوی کاروبار کو مثل ایک لغو اور باطل چیز کے ترک کر دو۔ ان اصول اسلامی کا غور سے مطالعہ کرنے والا اور نظرِ انصاف سے دیکھنے والا کسی طرح پر بھی یہ استنباط نہیں کر سکتا۔

اس کو بجز ذہانت طبعی اور حسبت باطنی کیا کہا جا سکتا ہے۔

اب ہم ان تمدنی فرائض کو بیان کرتے ہیں جو ایک مسلمان پر بہ حیثیت مسلم مذہب کی طرف سے فرض کیے گئے ہیں اور جو تعامل اور تعاون کے اصول پر پورے طور پر مادی اور زیست سہ گانہ کے جزو لاینفک ہیں تاکہ فلسفہ کے سرگروہوں اور نوع انسان کے درد مندوں کو یہ ثابت ہو جائے کہ وہ تمام مسائل جن پر انیسویں اور بیسویں صدی کے علمائے یورپ فخر کرتے ہیں درا صل اسی کی صدائے بازگشت ہیں جو چودہ سو سال پہلے مکہ اور مدینہ کی گھاٹیوں میں گونج رہی تھی۔

انسان اس دنیائے فانی میں ناقابل تغیر تعلقات اور مضبوط و مستحکم قوانین و ضوابط کی مسلسل کڑیوں میں جکڑا ہوا ہے ان تعلقات میں سے کچھ تو وہ ہیں جن کا تعلق صرف خدا سے ہے کچھ ایسے ہیں جو اس کی اپنی ذات سے وابستہ ہیں۔ کچھ اعزہ و اقارب سے متعلق ہیں اور بعض کا تعلق ابنائے جنس اور عامۃ الناس سے ہوتا ہے۔ یہی وہ تعلقات ہیں جن کی پورے طور پر انجام دہی تمدنی زندگی کا اصلی معیار اور انسانی فرائض کی بجا آوری ہے۔ اب وہ طاقت جو انسان کے ان تعلقات کو مناسب طور پر برتنے کی ہدایت کرتی ہے وہ نفس لوامہ ضمیر یا کانشنس کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ وہ بجا طور پر انسانی فرائض کی بجا آوری پر اطمینان و مسرت غلطیوں پر تاسف و ندامت اور لغزشوں پر تنبیہ و حسرت کا اظہار کرتی ہے۔ کانشنس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ان فرائض کی انجام دہی کے لیے بھی انسان کو منع کرے جن کا اس کو علم

نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف ان احکام کے متعلق بتاتا ہے جو انسان پر بذریعہ مذہبی کتب فرض ہیں اور علمی وسائل کے ذریعہ سے ان کا اس کو علم ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تعلقات کی بابت مذہب اسلام میں کہاں تک قوانین منضبط ہیں اگر بنظر غور و انصاف دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ایسا مکمل قانون ہے جس میں تمام فرائض دینی و دنیوی موجود ہیں اور انسان کے وقت پیدائش سے اس کی زندگی کے آخری لمحات تک کا پورا پروگرام مندرج ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق الناس کا مکمل طرز عمل موجود ہے۔ معاملات و معاشرت۔ تجارت و زراعت شجاعت و سخاوت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے علم و حکمت، تواضع و حمیت، صبر و قناعت، صدق و عدالت پر مفصل بحث ہے۔ غرض ہر قسم کے انسانی خصائل و جذبات کے قواعد منضبط ہیں اور جو ان سے واقف ہیں ان کا کانشنس ان کو صحیح طور پر ہدایت کرتا ہے

اب جبکہ انسان کا مدنی الطبع ہونا یعنی زلیست سہ گانہ کے قیام کے لیئے ان کی یکجائی ضروری اور لازمی جزو تمدن کا قرار پاگئی ہے تو اس کے لیے زیادہ ضروری چیز محبت یا اخوت ہے جس کے بغیر وہ مربوط شیرازہ ایک آن بھی قایم نہیں رہ سکتا ہر مسلمان کا بہ حیثیت مسلم یہ فرض ہے کہ وہ اپنے تمام ہم مذاہب لوگوں کو بلا اختلاف حیثیت، رنگ، عادت و خصلت خالص اس نظر سے دیکھے جو حقیقی اخوت اور محبت کا اقتضا ہے۔ محض اس بنا پر کہ وہ مسلم ہیں خواہ چینی ہوں یا تاتاری،

ہندی ہوں یا مصری، یورپین ہوں یا افریقی، امریکن ہوں یا سندھی ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ مسلمانوں کے باہمی برادرانہ تعلقات اس حدیث سے ثابت ہیں کہ تم "ہرگز جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک کہ مومن نہ ہو۔ اور تم ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ باہم محبت نہ کرو" یہ اور صدہا احادیث ہیں جن سے قومی سچی محبت کی دلیل ملتی ہے اور جو قومی سعادت کا اصل اصول اور تمدنی شائستگی کا سرچشمہ ہیں۔ یہی وہ اخوت قومی تھی جس نے مہاجرین مکہ کو جو محض غریب الوطن مسافر تھے شرفائے مدینہ کا حقیقی بھائی بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے تجارتی کاروبار اور موروثی املاک تک میں اکاحصہ قائم ہو گیا تھا۔ اور یہی وہ سچی مساوات ہے جو شبانہ روز میں پانچ وقت مسجد کی ایک صف میں بادشاہ اور رعایا کو دوش بدوش بلا اختلاف حیثیت دکھاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علمائے یورپ کے اس خیال پر بھی کچھ روشنی ڈالدی جائے کہ "اسلام غلاموں کو حیوان خیال کرتا ہے اور ان کی خرید و فروخت کے لیے بازار قائم کرنے کو ایک امر مستحب قرار دیتا ہے" چونکہ اس خیال سے ہماری اس مسلم مساوات کی ایک حد تک تردید ہوتی معلوم ہوتی ہے اس لیے اگر اس زمانہ کی تواریخ پر ایک سطحی نظر بھی ڈالی جائے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ وہ غلامی جس کو اس صدی کے حامیانِ حریت بنظر نوعیت دیکھتے ہیں موجودہ زمانہ کی سرداری اور آزادی سے

بدرجہا بہتر تھی۔ جو حقوق مذہباً ایک غلام کے اس کے مالک کے
ذمہ عائد ہوتے ہیں وہ اس کو مالک کے بالکل برابر بنا دیتے ہیں۔ وہ
خاندان کا ایک فرد اور شریک ہوتا ہے اور اس میں وہی اخوت کا حق باقی
رہتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جن
کو خدا نے تمہارے ماتحت کیا ہے لہذا کسی بڑے سے بڑے آدمی کو کسی ادنیٰ
سے مسلمان حبشی غلام پر فخر کرنیکا کوئی حق نہیں ہے" تاریخی واقعات اس پر دال
ہیں کہ صحابہ کبار نے کس طرح اس کو عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن
عوف جب اپنے غلاموں کے ساتھ باہر نکلتے تھے تو بہ سبب یکساں لباس و پوشش
اور برابر چلنے کے ایک اجنبی شخص کو آقا اور غلام میں تمیز تک نہ ہو سکتی تھی۔ اسی
طرح کا برتاؤ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تاریخ میں مذکور ہے کہ انہوں نے غلام کے ساتھ
بازار سے دو کپڑے خرید کیے جن میں ایک دوسرے سے زیادہ قیمتی تھا۔ آپ
نے بیش قیمت کپڑا تو اپنے غلام کو عطا فرما دیا اور کم قیمت اپنے واسطے رکھ لیا۔
اس پر غلام نے عرض کیا کہ اس کپڑے کے مستحق تو زیادہ تر آپ ہیں نہ کہ میں۔
میں آپ کا ایک ادنیٰ خادم و غلام ہوں لیکن آپ نے جواب دیا کہ میں بڈھا ہو گیا
ہوں لیکن تم ابھی جوان ہو، اس لیے تم ہی زیادہ مستحق ہو۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک جلیل القدر خلیفہ وقت تھے جن کے
رعب شاہی سے بڑے بڑے اولوالعزم سلاطین کے تخت لرزتے تھے لیکن حضرت

بلالؓ ایک حبشی النسل غلام کو سیدنا کے خطاب سے یاد فرماتے تھے۔ جب ان کا آخری وقت قریب ہوا اور خلافت کا معاملہ پیش ہوا اور جانشین کا سوال آیا تو آپ نے فرمایا کہ "اگر ابو حذیفہ کے غلام سالمؓ زندہ ہوتے تو میں خلافت کو شوریٰ پر کبھی منحصر نہ کرتا۔" ان چند واقعات سے اس زمانہ کی یا مسلمانوں کے غلاموں کی غلامی اور حریت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تھی وہ غلامی جہاں ایک غلام جانشین تخت و تاج تک کا مستحق ہوتا تھا اور جہاں حضرت بلال حضرت سالم اور حضرت سلمان اسلامی سوسائٹی میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر سرفراز تھے۔ کیا وہ غلام آجکل کے آزادوں سے زیادہ معزز اور فخر روزگار نہ تھے؟

اس مساوات کی بنیاد جس پر مشاہیر زمانہ ہر قسم کے تمدنی صلاح و فلاح کا انحصار رکھتے ہیں دراصل سب سے اول اسلام میں قائم ہوئی اور اسی بنیاد پر اسلامی شان و شوکت عزت و حریت کا قصر مستحکم اسقدر جلد تعمیر ہوا کہ دیگر اقوام آجتک متحیر ہیں۔ وہ مساوات نہ صرف آپس میں ایک دوسرے مسلمان ہی کے درمیان تھی بلکہ ایک ادنیٰ غیر قوم کے فرد اور ایک مسلمان بادشاہ وقت میں بھی وہی برتاؤ اور انصاف ہوتا تھا جسپر تواریخ شاہد ہیں متعدد واقعات ایسے پیش آتے ہیں جن میں ایک معمولی شخص کے مقابلہ میں بادشاہ اپنے عزیز و اقارب تک کو شرعی سزا دیتے تھے اور تمام مقدمات میں بالکل مساوات کا برتاؤ ہوتا تھا حاکم اور محکوم قوم کا رشتہ بہت نازک ہوتا ہے۔ ایک قوم کو برسر اقتدار ہو کر عدل و

انصاف پر قائم رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ رومیوں کے بیشمار واقعات ملتے ہیں کہ جہاں اپنے ہم مذہب کے ساتھ زیادہ رعایت ہوتی تھی دائرۃ المعارف میں ایک مقام پر اس طرح درج ہے کہ "روم میں سزائیں ایک ہی قسم کے جرائم میں مجرموں کی حالت اور حیثیت کے لحاظ سے مختلف دیجاتی تھیں" لیکن مسلم عدالتوں میں سزائیں بالکل عادلانہ ہوتی تھیں۔

اسلام نے جس طرح آپس میں ہم مذہبوں میں اخوت پیدا کی اسی طرح غیر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ بھی صلح و آشتی کی ہدایت کی ہے۔ اور ان کے لیے بھی جداگانہ قواعد منضبط کر دیئے ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح ایسے واقعات سے پُر ہیں جن میں آپ یہود اور نصاریٰ کی شرکت فرماتے تھے۔ ان کے جنازوں کی مشایعت کرتے تھے ان کی دعوت اور مجالس میں شریک ہوتے تھے اور تمام وہ تمدنی معاملات قائم رکھتے تھے جن کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ پھر بھی مسلم جب کسی ایسے شہر میں فاتحانہ شان و شوکت کے ساتھ داخل ہوتے تھے جہاں کے باشندے اعتقاداً اور مذہباً مختلف ہوتے تھے تو ان لوگوں کو کافی آزادی دیتے تھے۔ مسجدوں کے سامنے گرجاؤں میں گھنٹے اور مندروں میں ناقوسوں کی اجازت دیجاتی تھی۔ اور اسلامی تمدنی اصول کی پیروی میں دوسرے مذاہب اور معتقدات کے اقوام جن کے ساتھ وہ سکونت اور تعلقات قائم رکھتے تھے وہ فیاضانہ سلوک کرتے تھے جس کی نظیر نوع

انسانی کی تاریخ میں تلاش وجستجو لاحاصل ہے۔ ان میں حُسنِ معاشرت اس درجہ تھی
کہ فی زمانہ ناد حقیقی بھائیوں میں بھی ناممکن ہے۔ غرضکہ اسلام نے کوئی اصول
اور کوئی قاعدہ وقانون ایسا نہیں چھوڑا جو بہ حیثیت مذہب منضبط نہوا اور جس کو
صدر اسلام کے گروہ نے علمی جامہ پہنا کر اس کا اصلی فوٹو دنیا کے سامنے نہ
پیش کر دیا ہو۔ اس کے بعد خلفائے راشدین بنوامیہ اور بنو عباس نے بھی
اسی کا تتبع کیا اور اس گروہ کے دیگر شیوخ واکابر نے جس طرح اپنی زندگیاں
گذاریں اور جس قدر ترقیاں علوم حاصل کرنے میں کیں اور صنعت وحرفت
کے ماہر ہوئے وہ سب آج افسانہ ہو کر فنا ہو چکے ہیں۔ اخلاف اپنے اسلاف
کے ان عظیم الشان کارناموں سے بالکل بے خبر ہیں اور تمام علوم مشرقیہ اور
عالمان مشرقی جو کسی زمانہ میں تمدن کا سرچشمہ تھے اپنا کمال عروج دکھا کر علوم مغربیہ
کے افق میں غروب ہو چکے ہیں اور اب عالمان مغرب نے اس طرح ایک خوشنما
منظر عالم کے سامنے پیش کر دیا ہے جس طرح کہ آفتاب نظر فریب اپنی تمام
دن کی چمک دمک دکھا کر شام کو قریب الغروب افق پر ایک خوشگوار منظر پیش
کرتا ہے کوتاہ بین اس کی فضا میں ایسے محو ہو جاتے ہیں کہ اس کے اصل منظر
کو فراموش کر دیتے ہیں اور اس ظلمت سے بے خبر ہو جاتے ہیں جس کا وہ پیش خیمہ ہے
علوم مغربی کی ظلمت نے ہماری چشم بینا پر ایک پردۂ تاریکی ڈال دیا ہے اور زمانہ
کے متعدد پردے اس طرح درمیان میں حائل ہو گئے ہیں کہ ہم ان واقعات سے

بالکل بے بہرہ ہیں اور اس آخری جھلک کو اپنا معیار اصلی تصور کرنے لگے ہیں۔

اس موقع پر اس زمانہ کے چند واقعات کا انکشاف نامناسب نہ ہوگا۔ جبکہ اسلامی تمدن عروج پر تھا تاکہ ان بزرگوں کی سوانح اور حالات سے ان کی ترقیات اور طرز معاشرت کا کچھ اندازہ ہو سکے اگرچہ اس کام کے لیے جداگانہ ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ لیکن بطور مشتے نمونہ از خروارے حسب ذیل واقعات پر ہم کفایت کرتے ہیں۔ ان پر نظر ڈالنے سے ہم کو اس کا بھی اندازہ ہو جائیگا کہ وہ لوگ علوم کے حصول میں کس قدر محنت شاقہ برداشت کرتے تھے اور کس قدر دور دراز ممالک کا سفر پاپیادہ طے کرتے تھے جبکہ وسائل سفر بالکل محدود تھے۔

امام مالک نے حضرت سعید بن المسیب تابعی سے روایت کی ہے کہ میں ایک ایک حدیث کی خاطر راتوں اور دنوں پاپیادہ چلا ہوں۔ امام دارمی نے طلب حدیث میں۔ حرمین۔ عراق۔ خراسان۔ شام اور مصر کا سفر طے کیا تھا۔ امام بخاری امام ابوحاتم اور امام بغوی نے ہزاروں میل کا سفر پیدل طے کیا اور ان تمام ممالک کی سیاحت کی جہاں جہاں بھی راویانِ حدیث کا پتہ چلا۔ ایک ایک حدیث کے لیے جو جو مصیبتیں برداشت کیں وہ قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ ایک ہی بزرگ حافظ ابن مصرح نے حدیث کی سماعت سعید بن الاعرابی سے مکہ مکرمہ میں کی ابن راشد سے دمشق میں۔ قاسم بن اصبع سے قرطبہ میں جو اب کارڈوا کے نام سے اسپین میں موسوم ہے ابن سلیمان سے طرابلس میں۔ محمدؐ سے مصر میں اور دیگر مشائخ سے۔ جدہ صنعا

اور بیت المقدس میں یہ بزرگ محض اپنے جوش عقیدت اور طالب علمانہ حوصلہ کے ریل اور ہوائی جہاز پر سفر کرتے تھے ایک مادر زاد نابینا ابوالعباس رازی کا واقعہ درج ہے کہ گو وہ تمام مناظر قطرت اور سیاحی کے لطف سے محروم تھے لیکن محض احادیث نبوی کی سماعت کے لیے اُنہوں نے بلخ بخارا۔ نیشاپور اور بغداد کا سفر کیا اور حافظ حدیث ہوئے اس گروہ میں ہم کو خطیب تبریزی شارح حماسہ کی نظیر بھی ملتی ہے کہ جب ان کو لغت کی کتابیں مصنفہ ابوالمنصور دستیاب ہوئیں تو ان کے مطالب سمجھنے کے لیے وہ ملک شام میں مقام معرتہ کو علامہ ابوالعلا معری کی خدمت میں روانہ ہو گئے اور کتب کا پشتارہ اپنی پشت پر لاد کر لے گئے جب وہاں پہنچے تو وہ کتابیں اس قدر پسینہ سے بھیگ گئیں تھیں جیسے پانی میں ڈوب جاتی ہیں۔

فی زمانا جو تعلق شاگرد اور اُستاد میں ہوتا ہے وہ محض تجارتی اصول پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن علمائے سلف کے کارناموں سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ کسی خاص ماہر فن اُستاد کی شاگردی کے لیے لوگ سفر کے کس قدر مصائب و آلام برداشت کرتے تھے اور کس درجہ عقیدتمندی سے حصول علم میں کوشاں رہتے تھے۔ چنانچہ علامہ سید شریف کو بزمانہ طالب علمی یہ شوق ہوا کہ شرح مطالع خود اس کے مصنف سے پڑھیں چنانچہ وہ ان کی خدمت میں خراسان سے سفر کر کے ہرات گئے لیکن وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ اس قدر ضعیف ہو گئے ہیں

کہ ان کے قوائے دماغی بالکل جواب دے چکے ہیں۔ انہوں نے ان کی عالی ہمتی کو دیکھ کر اپنے شاگرد مبارک شاہ کے پاس جانے کی ہدایت کی اس لیے وہ ھرات سے قاھرہ پہنچے اور اسی شوق علم میں خراسان سے مصر تک کا سفر پا پیادہ طے کیا۔ مبارک شاہ نے ان کو اپنی شاگردی میں قبول کیا اور بالآخر بلند پایہ کے عالم ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ چھاپہ خانہ کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ درسی کتب کا کتب خانوں یا ایک اسٹالوں سے باوجود صرفِ کثیر ملنا محال تھا۔ طلبا کو صرف پڑھنے ہی کا ایک کام نہ تھا بلکہ درسی کتابوں کی کتابت بھی ان کو خود اپنے ہاتھوں کرنا پڑتی تھی چنانچہ علامہ تفتازانی کی تصانیف جب روم میں رائج ہوئیں تو وہ اسقدر معدوم تھیں کہ علامہ شمس الدین کو علاوہ جمعہ اور سہ شنبہ کے مدارس میں دوشنبہ کی تعطیل کا اور اضافہ کرنا پڑا جن ایام میں طلبا صرف کتابت میں وقت صرف کرتے تھے۔ حافظ ابن فراث نے جب انتقال کیا ہے تو ان کے پاس سے کتابوں کے اٹھارہ صندوق دستیاب ہوئے تھے جن میں اکثر و بیشتر کتب خود ان کے ہاتھ کی لکھی تھیں۔ سبط ابن جوزی سے منقول ہے کہ "میں نے اپنے دادا شیخ بن جوزی کو ممبر پر یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے اپنی ان انگلیوں سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں" جس شخص نے ڈھائی سو کتابیں تصنیف کر دی ہوں ان سے دو ہزار کتابوں کی کتابت کیا مشکل ہو سکتی ہے۔ انہیں کی بابت یہ مشہور ہے کہ جن قلموں سے انہوں نے احادیث لکھی تھیں ان کا تراشہ اتنا کثیر تھا کہ اس کے ایندھن

سے ان کے غسل میت کا پانی گرم کیا گیا تھا جس کام کے لیئے وہ شروع سے اس کو جمع کرتے رہے تھے۔ حضرت یحییٰ بن معین نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنے ہاتھ سے چھ لاکھ احادیث لکھی ہیں۔ امام ابواسامہ کوفی نے ایک سو دس برس کی عمر میں وفات پائی اور آخر عمر تک سلسلہ تحریر جاری رہا۔ اس زمانہ میں کتابت کی مہارت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ابوسعود رومی جو قسطنطنیہ کے مفتی تھے ان کی بابت لکھا ہے کہ وہ ایک روز میں ہزار ہزار خطوط کا جواب خود لکھ دیا کرتے تھے جن میں سے ایک دوسرے سے خوبی اسلوب اور حسنِ معنی میں زیادہ ہوتا تھا۔ کتابت میں اس درجہ شغف تھا کہ حافظ حدیث حُمیدی میورقی رات کو بوجہ گرمی پانی میں بیٹھکر لکھا کرتے تھے۔ درس و تدریس میں اس قدر انہماک ہوتا تھا کہ اس کے سامنے ہر چیز ہیچ معلوم ہوتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ان کا حافظہ ان کے اس کام میں بہت کچھ معین ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ امام دارقطنی اوائل عمر میں اسمٰعیل سفار کی مجلس املا میں موجود تھے۔ ان کے اُستاد تو ان کو املا لکھا رہے تھے اور یہ خود ایک کتاب کی نقل میں مصروف تھے۔ اس وقت کسی صاحب مجلس نے یہ اعتراض کیا تمہارا اسماع کس طرح قابل وثوق ہوسکتا ہے جبکہ تم نقل کتاب میں منہمک ہو ان کا جواب علامہ مذکور نے یہ دیا کہ سماع سماع میں بھی تو بہت فرق ہے اور پھر انہیں سے دریافت کیا کہ حضرات آپ تو ہمہ تن متوجہ ہیں یہ فرمایئے کہ اس وقت کس قدر احادیث بیان ہوتی ہیں چونکہ معترض صاحب

کو مجموعی تعداد یاد نہ تھی اس لیے مجبوراً خاموش ہونا پڑا لیکن امام صاحب موصوف نے فرمایا کہ اس وقت تک کل اٹھارہ احادیث املا کرائی گئی ہیں اور اس میں سے ہر ایک کا جداگانہ متن اور اس کی اسناد سب لفظ بہ لفظ بیان کر دیں اسی طرح ایک مرتبہ کا قصہ مذکور ہے کہ علی ابن الحسن بعد نماز عشا حضرت عبداللہ بن المبارک کے ساتھ مسجد سے اٹھے مسجد کے دروازہ پر کسی حدیث کے بارے میں مباحثہ شروع ہو گیا۔ اس قدر انہماک ہوا کہ فجر کی اذان ہو گئی اور دونوں صاحب مسجد میں واپس چلے گئے اور نماز فجر ادا کر کے اپنے مکانوں کو واپس گئے ۔

یہ اور اس قسم کی اکثر مثالیں اس زمانے کے حالات پڑھنے سے ملتی ہیں جن سے اس زمانے کے طرز معاشرت اور علوم کے حصول کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس زمانے کے حالات کا کچھ اندازہ ایک طالب علم کی مختصر لائف سے بھی بخوبی ہو سکتا ہے جہاں علامہ اصیبعہ نے اپنے چچا رشید الدین کی بابتہ ایک موقع پر لکھا ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے قرآن شریف حفظ کیا اس کے بعد فن ریاضی میں تکمیل کی اس کے بعد طب شروع کی اور مصر میں تقریباً سو رسالہ طب جالینوس کے ازبر یاد کئے اور اس کے بعد شفا خانوں میں جا کر عملی دستگاہ حاصل کی اور اس سلسلہ میں فن کحالی یعنی آنکھوں کے متعلق تمام علوم کی تکمیل کی اور پھر جراحی میں مشق مہارت کے درجہ کو پہنچائی اس کے بعد ادب اور فلسفہ شیخ عبداللطیف بغدادی سے حاصل کیا اور منطق استاذ علامہ صدرالدین صاحب

منطق سیکھی۔ انہوں نے نہ صرف اس پر اکتفا کیا بلکہ فن نجوم میں ابو محمد جعفری سے اور علوم موسیقی میں ابن دیحور سے کامل دستگاہ حاصل کی۔

یہ تمام علوم انہوں نے اپنی عمر کے بیسویں سال میں ختم کر لئے تھے۔ اس وقت وہ ملکِ شام میں اپنا مستقل مطب کرنیکی غرض سے اقامت گزیں ہوئے لیکن سلسلہ درس کا برابر جاری رہا۔ وہ علاوہ دیگر زبانوں کے ترکی اور فارسی زبانوں سے بخوبی واقف تھے اور فارسی اشعار بھی کہتے تھے"۔ یہ تو ایک طالبعلم کی زندگی کی مختصر سرگذشت ہے لیکن اسی طرح کی اکثر مثالیں تواریخ سے ملتی ہیں جنہوں نے کوئی علم ایسا نہیں چھوڑا تھا جس میں پورے طور پر کمال نہ پیدا کر لیا ہو۔

قرطمہ کی بابت مشہور ہے کہ ان کی لائبریری کتابوں سے معمور تھی انہوں نے ایک بار کسی ملنے والے سے کہا کہ اس میں سے جو کتاب چاہو نکال کر مجھسے دریافت کر لو چنانچہ انہوں نے انکا امتحان لیا تو کوئی کتاب ایسی نہ ملی جو از اول تا آخر ان کے نوک زبان نہو۔ حضرات اصمعی۔ ابو عبیدہ۔ ابوبکر نحوی۔ ابو حاتم رازی اور ابوزرعہ اپنی قوتِ حافظہ میں مشہور گزرے ہیں۔ ایک مقام پر مجدالدین فیروز آبادی لکھتے ہیں کہ "میرا یہ دستور تھا کہ میں جب تک دو سو سطور حفظ نکر لیتا تھا سوتا نہیں تھا ہم کو اس گروہ میں ایسی ہستیاں بھی نظر آتی ہیں جن کی طالب علمانہ زندگی ان کے آخری دم تک ساتھ رہی اور مطالعہ کا شوق اور انہماک ہی ان کی ہلاکت کا سبب ہوا اس کی مثال میں امام ادب ابو العباس ثعلب کی وفات حسرت آیات

پیش کی جاتی ہے۔ وہ ایک روز بعد فراغت نماز جمعہ اپنے مکان کو واپس جا رہے تھے کتاب کے مطالعہ کا شغف راستہ میں بھی بدستور جاری تھا کیا نوے سال کی عمر۔ ادھر ثقل سماعت اور ادھر کتاب میں محویت اتفاقاً راستہ میں ایک گھوڑے سے مڈبھیڑ ہو گئی اور اس کے صدمہ سے بیہوش ہو کر ایسے گرے کہ وہیں جان بحق ہو گئے۔

کتاب حماسہ جو آج کل ادبی دنیا میں مشہور و معروف کتاب مانی جاتی ہے اس کی تالیف اس انہماک اور شوق مطالعہ کی وجہ سے ہوئی ہے اس کا واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ ابو تمام طائی مولف حماسہ اور شاعر نامور دربار خراسان کے لیے عازم سفر ہوئے۔ جب مقام ہمدان پر پہنچے تو سردی کی کثرت اور برف باری کی زیادتی نے تمام راستے مسدود کر دیئے۔ مجبوراً ان کو وہاں چندے قیام کرنا پڑا۔ جن صاحب کے یہاں وہ مقیم تھے ان کی لائبریری کتب سے معمور تھی۔ انہوں نے وقت کو غنیمت جانا اور تمام شعرائے عرب کے مشہور دیوان نکال کر ایک مجموعہ تیار کیا اور اس کا نام الحماسہ رکھا۔

امام نحو یونس کی کل عمر اٹھارہ سال کی ہوئی ہے جس میں انہوں نے یہ مرتبہ پایا کہ فن نحو کے امام ہو گئے۔ انہیں کی بابت ابن خلکان ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "تمام عمر ان کی شادی نہیں ہوئی اور دم آخر تک پیش نظر بجز طلب علم اور مباحث علمیہ اور کچھ نہیں رہا"۔

ان میں سے اکثر تصانیف ایسے وقت کی ہیں جبکہ مصنف کو جان تک کے لالے پڑے تھے حاکم وقت کے ظلم سے ان کے جسم قیدخانوں میں مقید تھے لیکن شوق علم توسن قلم پر پرواز کر رہا تھا۔ منجملہ ان کے ایک شیخ الرئیس تھے جنہوں نے ایک عطار کے گھر پناہ لی تھی اور اپنا دماغ تصنیف میں صرف کر رہے تھے اور اس طرح انہوں نے فن طبعیات اور الٰہیات ختم کر دیئے لیکن وہاں سے گرفتار ہو گئے تو پھر فروجان کے قلعہ کو بھیج دیئے گئے اور انہوں نے وہاں بھی اپنا سلسلہ تصنیف جاری رکھا اور کتاب الہدایات۔ رسالہ حی ابن یقظان اور کتاب قلنج کی مکمل کتب تیار کیں۔ اسی طرح شمس الائمہ سرخسی نے ایک بلند پایہ کتاب علم اصول میں تصنیف کی اس کی تصنیف کا آغاز خوارزم کے قیدخانہ میں ہوا اور اختتام رہائی کے بعد فرغانہ میں ہوا۔

یہ تو وہ حضرات تھے جو علوم مشرقیہ کی فضائے آسمانی پر چاند اور ستارے تھے جن میں سے ہر ایک۔ زہرہ۔ مشتری۔ اور مریخ سے کم نہ تھا لیکن یہ فضائے آسمانی بے شمار ستاروں سے روشن تھا۔ جن کی تعداد کا کچھ اندازہ واقعات ذیل سے ہو سکتا ہے۔ شہر بغداد میں ایک مرتبہ سلیمان بن حرب کے واسطے ایک بلند پلیٹ فارم تیار کیا گیا تھا جس پر وہ املائے حدیث کیا کرتے تھے اور اس میں امراء و رؤساء شریک ہوا کرتے تھے جب اس مجمع کا اندازہ کیا گیا تو چالیس ہزار آدمیوں کا تخمینہ ہوا۔ خلیفہ معتصم باللہ نے ایک مرتبہ اپنے محتسب کے ذریعہ سے

امام عاصم بن علی کی جماعت کا اندازہ کرایا تھا تو اس میں ایک لاکھ بیس ہزار کی تعداد تھی۔

تیسری صدی ہجری میں ایک ایک مجلس علمیہ میں دس دس ہزار دواتیں رکھی جاتی تھیں۔ امام بخاری کے صرف ایک شاگرد سے جن کا نام فربری تھا نوے ہزار لوگوں نے درس لیا تھا مسلم بن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے ایک شہر بغداد میں آٹھ سو شیوخ سے فن حدیث حاصل کیا۔ اس کے علاوہ اور شہروں میں مختلف فنون کے جو استاد ہوں گے ان کا کوئی شمار بھی نہیں ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں تعلیم کا کیا حال تھا اور کس طرح کا ربط استاد اور شاگردوں میں قائم رہتا تھا۔ جب ایک شہر میں ایک فن کے آٹھ سو سے زیادہ استاد کامل ہوں تو وہاں کے شاگردوں اور تہذیب و تمدن کا کیا اندازہ ہوسکتا ہے۔ پھر ان لوگوں کی جو عظمت و وقعت ان کے شاگردوں اور عوام کے دلوں میں ہوتی تھی وہ اس سے ظاہر ہے کہ امام ادب نضر بن شمیل جب بصرے سے خراسان کو جانے لگے تو تین ہزار شخص ان کی مشایعت میں شہر سے باہر تک گئے اور یہ گروہ صرف ان علما کا تھا جو علم لغت علم عروض اور علم حدیث میں ماہر تھے۔ کسی خاص استاد کا شاگرد ہونا فخر خیال کیا جاتا تھا اور اس سے محرومی پر عمر بھر کف افسوس ملا جاتا تھا۔

چنانچہ امام ابوالعاص کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اوائل عمر میں

بزمانہ طالب علمی اپنی والدہ سے امام قتیبہ کی خدمت میں شرف شاگردی حاصل کرنے کی اجازت چاہی لیکن اُنہوں نے باقتضائے محبت اپنے بیٹے کو اسقدر دور دراز سفر پر بھیجنا اور اپنی آغوش محبت سے علیحدہ کرنا مناسب نہ خیال کیا لیکن جب ان کا انتقال ہو گیا تو امام موصوف اپنی حسرت پوری کرنے کی غرض سے فوراً بلخ کو روانہ ہو گئے لیکن وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ امام قتیبہ انتقال کر گئے۔ یہ سنکر ان کو بیحد رنج والم ہوا اور اپنی اس محرومِ القسمتی پر ہمیشہ محزون رہے۔ ان کے احباب ان کی اس محرومی پر تعزیت کرنے ان کے پاس آئے۔

جہاں علما کا فیض علوم دینی و دنیوی عامتہ الناس کے لیے اس قدر وسیع تھا وہاں مسلمان امرا اور سلاطین بھی اس چشمہ سے کچھ کم فیضیاب نہ تھے چنانچہ بنی موسٰی اور سیف الدولہ کے علمی فضائل اظہر من الشمس ہیں۔ اسی طرح فخر الدولہ کے وزیر اعظم صاحب ابن عباد علم ادب میں مہارت کامل رکھتے تھے ایک موقعہ پر ان کو امیر بخارا نے اپنی وزارت کے معزز عہدے سے سرفراز کرنے کے لیے طلب کیا تو انہوں نے منجملہ دیگر عذرات ایک یہ عذر بھی پیش کیا تھا کہ میری کتابوں کے اُٹھانے کے واسطے چار سو اُونٹوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ سفر کرتے تھے تو صرف علم ادب کی کتابوں کے تیس اُونٹ ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔

یہی وہ گروہ اسلام تھا جو علوم ظاہر و باطن سے کما حقہٗ واقفیت پیدا کر کے تمدنی زندگی۔ حق پسندی اور راست گوئی کا بہترین نمونہ تھے۔ ایثار خلق اور

صلح جوئی کے خوگر تھے۔ ایثار وخلق کا جو نمونہ اُنہوں نے پیش کیا وہ تواریخ زمانہ میں ملنا ایک حد تک محال ہے اس کی مثال میں ہم صرف ایک واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں جو بہت مشہور ہے یعنی جنگ یرموک میں جب قتل وغارتگری کے بعد ہر چہار طرف کُشتوں کے پُشتے نظر آتے تھے اس وقت حضرت حُذیفہ عدوی اپنے چچازاد بھائی کی تلاش میں تھوڑا سا پانی لیکر نکلے اتفاقاً ان کو ایسی حالت میں پایا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کر رہے تھے اور شدت پیاس سے بیتاب تھے اُنہوں نے ان کو وہ پانی پلانا چاہا لیکن دفعتاً آواز آئی کہ کاش پانی ہوتا! اس نازک حالت میں بھی اُنہوں نے اپنی پیاس پر دوسرے کی شدت تشنگی کو ترجیح دی اور ان کی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے اپنے بھائی کو اشارہ کیا کہ یہ پانی ان کو دیدو مجھسے زیادہ وہ ضرورتمند معلوم ہوتے ہیں لیکن جب وہ پانی لیکر وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ شخص جن کو پانی کی ضرورت تھی شہید ہو چکے ہیں بالآخر پھر اپنے بھائی کے پاس پانی واپس لائے لیکن اب شدت پیاس سے بیتاب ہو کر یہ بھی اپنے ایثار کا نمونہ دنیا میں چھوڑ کر جام شہادت نوش کر چکے تھے۔

اس طرح پر جو نمونہ خلق و تواضع کا ان لوگوں نے پیش کیا وہ اسی اخوت اسلامی کے اصول پر کاربند ہونیکا نتیجہ تھا۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ امام مالک سے عمر میں تیرہ سال بڑے تھے اور فضل وکمال میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے لیکن جب امام مالک سے ملاقات کرتے تھے تو اس طرح پر جیسے کہ چھوٹے اپنے بڑوں سے ملتے ہیں:۔

حضرت بن عمر و امام مجاہد کے گھوڑے کی رکاب تھام لیا کرتے تھے محض اسی وجہ سی کہ وہ تابعی تھے۔

اشہب ابن عبد العزیز کہتے ہیں کہ "میں نے امام ابو حنیفہ کو امام مالک کے سامنے ایسا مؤدب بیٹھے دیکھا ہے جیسے کہ خورد اپنے بزرگوں کے سامنے باادب بیٹھا کرتے ہیں۔" ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل کے پاس امام ذہلی آئے تو امام حنبل ان کی تعظیم کے لیے سروقد کھڑے ہو گئے۔ درآنحالیکہ ان کا مرتبہ ان سے کہیں زیادہ تھا۔ انہوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ اپنے صاحبزادگان اور شاگردوں کو بھی ان کے پاس بھیجدیا تھا کہ ان سے سبق لیا کریں۔

امام محمدؒ اور امام شافعی میں بعض جزئیات میں باہم اکثر اختلاف رہا لیکن باوجود اس کے امام محمدؒ جس قدر امام شافعی کی عزت و توقیر کرتے تھے اتنی کسی دوسرے عالم کی نہیں کرتے تھے۔

سوانح ائمہ ان مثالوں سے پر ہیں کہ انہوں نے اپنے نفس کی خود پسندی کو کبھی حق پر غالب نہیں ہونے دیا اور جلیل القدر اماموں اور پیشواؤں نے اپنے شاگردوں کی شاگردی میں بھی عار نہیں کیا ہے چنانچہ یحییٰ ابن معین اپنے شاگرد رشید امام حنبل کی نسبت فرماتے تھے کہ "لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں مثل احمد ابن حنبل کے ہو جاؤں لیکن خدا کی قسم میں ان کے رتبہ کو نہیں پا سکتا" یہ رائے ایک استاد کی اپنے شاگرد کے بارے میں ہے۔

اسی طرح حماد ابن زید اپنے ہمعصر محدث شعبہ کی نسبت فرماتے ہیں کہ "جب کسی حدیث میں میری اور شعبہ کی مخالفت ہوتی ہے تو میں اپنی رائے کو چھوڑ دیتا ہوں اور شعبہ کی رائے کو اختیار کر لیتا ہوں اس لیے کہ وہ اپنے اُستاد سے ایک حدیث کو بیس مرتبہ سنکر بھی تسکین نہیں پاتے تھے اور میں صرف ایک مرتبہ ہی سُنکر قناعت کر لیتا تھا"۔ امام زین العابدین اپنے شاگرد زید ابن اسلم کے پاس بغرض استفادہ بیٹھا کرتے تھے۔ اسلامی اصول تمدن کے لحاظ سے دشمنوں تک کو بُرا کہنا یا ان پر لعنت کرنا یا ان کے ساتھ بُرا سلوک کرنا بھی کسی طرح جائز نہیں بلکہ غیر مذاہب کے لوگوں سے مراعات کرنے کے لیے ہدایات کی گئی ہیں

جب کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ کو قتل کر کے ان کے ناک کان کاٹے تھے اور ابوسفیان کی بی بی نے ان کا جگر چبا ڈالا تھا تو اس وقت آپ کو اس حادثہ کا اسقدر فطری رنج ہوا تھا کہ آپ نے مشرکین کے حق میں بددعا فرمائی لیکن فوراً الہام الٰہی ہوا کہ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ چنانچہ آپ بددعا سے باز رہے اور فرمایا کہ میں جب کبھی بھی موقع ملے گا ان کے چالیس آدمیوں کو مُثلہ کر کے چھوڑوں لیکن اس کے متعلق بھی حکم خداوندی ان الفاظ میں نازل ہوا کہ فَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِن صَبَرْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ۔ آنحضرت نے مخالفین کو ان کی مراعات اور مناسب تکریم کا حکم دیا اور اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ آپ کے صحابہ کرام اکثر اسیران جنگ کی خاطر مدارات کرتے

تھے اپنی روٹی تک ان کو دیدیتے تھے اور خود صرف کھجوروں پر بسر کرتے تھے۔
یہی وہ اصول تھے جن کی بنا پر آگے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ شریف رضی جیسے شریف النسب نے اپنے ہمعصر ابو اسحٰق کی وفات پر اس کے شاعرانہ کمالات کی وجہ سے مرثیہ لکھدیا تھا حالانکہ وہ مذہب اسلام کا مخالف ایک صابی شخص تھا۔

تمدنی زندگی کا اصلی معیار دولت وثروت کی کثرت خیال کی جاتی ہے چنانچہ جو اقوام زیادہ متمدن سمجھی جاتی ہیں وہ متمول اور مالدار بھی ہوتی ہیں لیکن اسلام کی تصویر میں یہ رخ ہر جگہ سے غائب دکھایا جاتا ہے اور اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ وہ ایسی جماعت یا اس سوسائٹی سے متعلق ہے جو ہمیشہ فقر وفاقہ میں بسر کرتے ہیں اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے گمنامی کے عالم میں مسجدوں کے حجروں میں بود و باش رکھتے ہیں گویا جس طرح تمدن وتمول لازم وملزوم ہیں اسی طرح اسلام وافلاس ایک دوسرے کا جز ہیں ان گذر اوقات خیرات وزکاۃ پر ہوتی ہے اور ان میں خود کمانے کی اہلیت ہی نہیں ہوتی بلکہ دوسرے اقوام کے دست نگر رہتے ہیں۔

یہ اسلام کی وہ تصویر ہے جو اس بیسویں صدی عیسوی میں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیائے اسلام میں نظر آتی ہے۔ لیکن اگر ذرا کتاب الٰہی کی طرف رجوع کیا جائے تو اس مسئلہ پر نص صریح ہم کو ملتی ہے کہ لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ یعنی دنیائے اسلام کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ تم لوگ اپنی ہمتوں کو پست مت کرو بلکہ مومن ہمیشہ ممتاز رہتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ لَا بَأْسَ بِالْغِنَى لِمَنِ

اتقی اللہ عزّ وجلّ" اسی طرح ایک دوسری حدیث شریف جو حضرت سعد سے مروی ہے ان الفاظ میں اس مضمون کی تائید ہوتی ہے کہ اِنَّ اللہَ یُحِبُّ العَبدَ التقی الغنی الخفی۔

اسی طرح اگر اسلامی تواریخ سابقہ کو دیکھا جائے تو واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام کی جو تصویر اوپر کھینچی گئی ہے وہ واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ گو اہل کمال کے لئے مالدار ہونا کوئی خوبی نہیں ہے یا کسی مسلم کا دولت وثروت میں تعیشانہ زندگی بسر کرنا لازمی نہیں ہے اور نہ اس کے عدم وجود سے ان کی عظمت ووقعت عزت وحرمت میں کسی طرح کی کمی ہو سکتی ہے لیکن تاہم یہ ایک دوسرے کے منافی بھی نہیں ہیں۔ باعتبار چند وجوہ اور حالات خاص اس کا مخالف پہلو ذہنوں میں راسخ ہو گیا ہے ورنہ انہیں علمائے دین۔ اولیائے متین اور آئمہ مذہب کے گروہ میں ایسے لوگ گذرے ہیں جنہوں نے ایسی دولت وثروت کو جو سرتا غفلت تصور کی گئی ہے کس طرح خیر وبرکت کا سبب بنا دیا تھا۔ اور باوجود متمول ہونے کے عنان مذہب کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اگرچہ اس قسم کے نظائر بکثرت ہیں لیکن اس موقع پر چند بطور مثال پیش کی جاتی ہیں۔

امام لیث مصری کی سالانہ آمدنی اسّی ہزار اشرفیاں تھیں جس کے حساب سے سکہ رائج الوقت کے آٹھ لاکھ روپیہ ہوتے ہیں لیکن باوجود اس قدر دولت کثیر کے ان پر کبھی زکاۃ فرض نہیں ہوئی یعنی وہ ایک سال پورا گذرنے سے پہلے ہی سب

آمدنی مصارف تعمیر میں صرف کر دیا کرتے تھے۔

دوسرے بزرگ امام وعلج بغدادی تھے جو دارقطنی کے اُستاد تھے ان کی ثروت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عراق اور سجستان کے علمائے حدیث کو ان کے یہاں سے وظائف ملا کرتے تھے ان کا ایک مکان مکہ مکرمہ میں تھا۔ جس کو اُنہوں نے تیس ہزار اشرفی میں خرید کیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد تین لاکھ اشرفیاں معزالدولہ کو ترکہ میں ملی تھیں۔

امام ابوالہیثم کی بابتہ یہ لکھا ہے کہ وہ بہت زیادہ مالدار تھے اور اُنہوں نے تین چار مرتبہ اپنے ہم وزن چاندی خیرات کر دی تھی حافظ ابن العربی کی دولت اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ وہ اس آمدنی کا کل روپیہ نیک کاموں میں خرچ کیا کرتے تھے۔ اشبیلیہ جو اندلس میں ایک شہر تھا اس کی تمام شہر پناہ اُنہوں نے اپنے ذاتی روپیہ سے تعمیر کرائی تھی۔

قاضی عیاض صاحب مشارق الانوار کی بابتہ لکھتے ہیں کہ ان کو اپنے زمانہ میں اسقدر وقعت۔ عزت اور دولت حاصل تھی کہ کبھی کسی کو ان کے شہر میں نصیب نہیں ہوئی انہیں کی نسبت ایک موقع پر امام ذہبی فرماتے ہیں کہ جسقدر ان کی رفعت میں ترقی ہوئی اسی قدر ان کی تواضع اور خوف الٰہی میں ترقی ہوتی گئی۔

شیخ ابوحامد اسفرائنی کی بابتہ ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ "ان پر دین و دُنیا کی دولت ختم ہو گئی تھی۔ اور ان کا قیام شہر بغداد میں تھا" گویا جسقدر

وہ متقی اور دیندار تھے اسی قدر وہ صاحب ثروت بھی تھے۔

یہی بزرگان دین اور علمائے کرام جو اسلامی تمدن کا پیش خیمہ تھے اپنی ظاہر صفائی اور پاکیزگی طبع میں بھی دیگر ہمعصر اقوام سے کچھ کم نہ تھے چنانچہ امام دارالہجرت حضرت مالک نہایت قیمتی اور فاخرہ لباس زیب تن فرماتے تھے انہیں کا یہ مقولہ ہے کہ "میں نے مدینہ طیبہ میں جتنے فقہا دیکھے وہ سب خوش پوشاک دیکھے"۔

امام ابوحنیفہ نہایت بیش قیمت لباس پہنتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ ابن المبارک کے چادر کا تخمینہ کیا گیا تو تیس اشرفی ہوا تھا اور ایک اور مرتبہ ان کے پیراہن اور ایک دوسری چادر کی قیمت چارسو درہم اندازہ کی گئی تھی۔

امام اعظم جب کبھی باہر تشریف لیجاتے تھے تو دور دور سے لوگ پہچان لیتے تھے کہ امام صاحب تشریف لا رہے ہیں چونکہ نہایت بیش قیمت اور اعلیٰ قسم کا عطر ہمیشہ استعمال فرمایا کرتے تھے۔

شیخ الاسلام ہروی جن کا زہد و ورع مشہور ہے ان کی بابت لکھا ہے کہ وہ جب کبھی باہر جایا کرتے تھے تو لباس فاخرہ پہنے ہوتے تھے اور ایک بیش قیمت گھوڑا ان کی سواری میں ہوتا تھا۔ وہ خود فرماتے تھے کہ "میں اپنا ذاتی اظہار حشمت نہیں چاہتا ہوں بلکہ اسلام کے معزز کرنے کے لیے یہ استعمال کرتا ہوں"۔

اسلامی تمدنی تاریخ میں جہاں ہم کو اس قدر صاحب ثروت ہستیاں نظر آتی ہیں جن کی دولت نے ان کے دین میں چار چاند لگا دیئے تھے وہاں دوسری طرف

ہم کو ایسے افراد بھی ملتے ہیں جو اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دیتے تھے اور ان کی شان و عظمت میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دولت و ثروت منافی ورع و اتقا نہیں اسی طرح عدم زر و جواہر بھی دین میں کسی طرح حارج نہیں ہوتا۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام لائف اس کا ثبوت ہے کہ باوجود طاقت و قدرت آپ نے دولت و ثروت کو باعث عزت کبھی خیال نہیں فرمایا چنانچہ آپ ہمیشہ اپنے دستِ مبارک سے بکریوں کو دوہا کرتے تھے اور پھٹے کپڑوں کو سیتے تھے حضرت انس سے مروی ہے کہ "میں دس سال تک پیغمبر خدا کی قدمت اقدس میں رہا اور اس زمانہ میں جسقدر کام انہوں نے میرے کر دئے اتنی خدمت میں نہ کر سکا"۔

امام جبال استاد حدیث کی بابت لکھا ہے کہ جب امام ابن طاہر نے ان کی خدمت میں تحصیل علم کے لیے جانا چاہا تو لوگوں نے ان کو یہ پتہ دیا کہ امام صاحب موصوف بازار میں ملین گے چونکہ خرید و فروخت کے لیے وہ اکثر وہیں جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ جب یہ وہاں پہنچے تو اول بازاروں میں گشت لگایا اور بالآخر امام صاحب کو اس ہیئت میں پایا کہ اپنے دامن میں تمام ضروری اشیا بھرے ہوئے ایک عطار کی دوکان پر بیٹھے تھے اس وقت ان کی عمر بھی اناسی سال کی تھی۔

امام بخاری نے شہر بخارا سے باہر ایک سرائے تعمیر کرائی اس کی تعمیر کے وقت

جب مزدور اینٹیں لیجاتے تھے تو امام صاحب خود اینٹیں اُٹھا اُٹھا کر مزدوروں کے ساتھ معماروں کو دیتے جاتے تھے اس وقت کسی شاگرد نے از راہ دلسوزی ان سے سوال کیا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ "یہ ایسا کام ہے جو نفع دیتا ہے اور اللہ تعالے مجھکو سلف صالحین کے اتباع کرنے کا اجر دیگا۔"

یہ وہ بزرگان ہیں جو اپنے زمانے کے امام وقت ہوئے ہیں گویا چشمہ علم و فضل سے پورے طور پر سیراب ہو چکے تھے دولت اور ثروت اس سے ہی ظاہر ہے کہ ایک مسافر خانہ اپنے ذاتی روپیہ سے تعمیر کرا رہے تھے گویا کہ بخارا کے رئیس اعظم تھے لیکن باوجود اس کے محض اتباع سلف کے خیال سے اپنے ہاتھوں سے کام کرتے تھے۔ کیا اس سے ان کی توقیر میں کچھ بھی فرق آیا؟ ان کی شان اس وقت بدستور قائم تھی بلکہ اس میں اور اضافہ ہو گیا کہ آجتک وہ اخلاف کے لیئے نظیر قائم کر گئے جس کی مثال کسی دوسری قوم میں ملنا مشکل ہے۔

اس موقع پر عرب کا وہ شاندار دور بھی دکھا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جو تیزی زمانہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ یہی سرزمین عرب جو دور بداوت سے نکل کر دورِ حضارۃ میں آچکی تھی اُن تمام اشیائے ضروریہ سے متمتع ہوئی جن کی اختراعات نے آئندہ نسلوں کو محو حیرت بنا دیا۔ تواریخ کی ورق گردانی نمایاں طور پر بتاتی ہے کہ اس نے کس طرح تنظیم ممالک کی طرف توجہ کی۔ مفتوحہ و مقبوضہ ملکوں کی زمین کو شاداب و بارآور بنایا۔ بڑے بڑے بندرگاہوں

تسخیر کے بعد تجارتی سلسلوں کے بڑھانے کے لیے بڑے تیار گئے۔ اس کے بعد جب ملک اقتصادی مصائب و آلام سے گذر گیا اور سیاسی اغراض کی جنگ ختم ہوگئی تو ان کی طبیعت کی جودت علوم و فنون۔ صنعت و حرفت ایجادات و اختراعات کی طرف متوجہ ہوئی جو ایک متمدن قوم کا فطری جذبہ ہوتا ہے۔
تمام علوم و فنون جو مختلف زبانوں میں موجود تھے ان کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی سعی کی گئی۔ چنانچہ خلیفہ مامون رشید نے اپنے زمانہ خلافت میں یونان کے تمام علوم عربی زبان میں ترجمہ کرائے ان علوم کا ایک بڑا حصہ فلسفہ اور منطق کے دقیق مسائل پر مشتمل تھا۔ بعد ازاں عربوں نے علم منطق۔ فلسفہ ریاضی جغرافیہ طبعیات۔ جرثقیل۔ فنون اکتشافات۔ علم حیوانات و نباتات علم طب مصوری سنگ تراشی۔ فن تعمیر اور فن تجارت میں نمایاں ترقی کی ان میں سے اکثر خود انہیں کی ایجاد بھی ہیں۔

اس کے علاوہ ملکی و معاشرتی انتظامات بین الاقوامی تعلقات اور اصول سلطنت وہ امور تھے جن کی بنا پر تمدن کی عمدگی کا انحصار ہوسکتا ہے۔ چنانچہ یہ بھی عرب میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ ان کے ملکی و معاشرتی قوانین قرآن حکیم و سنت رسول کریم سے ماخوذ تھے۔ صحابہ اور تابعین کے دور تک وہ عجمیت سے اس قدر متصل نہ ہوئے تھے کہ طرز معاشرت میں کوئی نمایاں ترقی کا اضافہ کرتے۔ ان کی معاشرتی زندگی بالکل سادہ تھی جو قرآن شریف اور احادیث

سے ماخوذ تھی۔ باہمی مقدمات کے فیصلے نہایت سادگی اور صحیح اصول پر کئے جاتے تھے اور مساوات ان میں حددرجہ قائم تھی۔ ایک مسلمان خواہ وہ کسی گوشہ ملک کا رہنے والا کیوں نہو کسی اسلامی ملک میں جاکر مبتذل نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے وہ تمام حقوق تھے جو وہاں کے خاص مسلمان باشندوں اور امیروں کے لئے ہوسکتے تھے۔ ان کی اپنی ذمی رعایا کے ساتھ ان کا برتاؤ نہایت عمدہ تھا ایک معمولی سے ٹیکس کے عوض میں ان کی جان و مال اور عزت کی نگہبانی کیجاتی تھی۔ یہاں تک کہ ملک کے ممتاز اور عہدہائے جلیلہ پر فائز کئے جاتے تھے اور ان کو کسی بات میں روک ٹوک نہ تھی۔ ان کی معاشرتی زندگی نہایت مکمل تھی جس کا اعتراف خود اہل یورپ کرتے ہیں۔ چنانچہ موسیو لیبلے جو ایک نہایت محقق عالم اور مذہبی مصنف ہیں اور جنہوں نے مشرق پر ایک بے نظیر کتاب تصنیف کی ہے ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "مسلمان اُن نظامات میں جو مزدوری پیشہ اقوام کی بہبودی کے متعلق ہیں اس وقت تک ان سخت غلطیوں سے بچے ہوئے ہیں جو مغرب میں بالعموم واقع ہوتی ہیں۔ اور ان میں اب تک وہ عمدہ نظامات کامل طور سے باقی ہیں۔ جن کے ذریعہ سے انہوں نے امیر و غریب۔ غلام و مالک میں صلح قائم رکھی ہے۔ اسی قدر کہدینا کافی ہے کہ وہ قوم جس کو تعلیم دینے کا دعویٰ یورپ کر رہا ہے فی الواقع وہ قوم ہے جس سے خود اسے سبق لینا چاہئے" اس کے بعد ہم عربوں کے ملکی نظامات کے متعلق بیان کرتے ہیں اگرچہ

اس کے متعلق مبسوط و مفصل لکھنے کے لیے مستقل ایک تصنیف کی ضرورت ہے لیکن اس کا مختصر حال جو عربی تصانیف میں درج ہے۔ لکھتے ہیں۔ خلفائے بنو امیہ نے جب اپنا دارالسلطنت مدینہ منورہ کے بعد دمشق تجویز کیا تو اس کے ساتھ ہی تمام ملکی انتظامات میں ترقی کرنا شروع کی لیکن اس ترقی کا عروج عباسیوں کے زمانہ میں ہوا چنانچہ خاندان عباسیہ کے عروج کا آفتاب جب نصف النہار پر پہنچا تو انہوں نے دمشق کے دارالسلطنت کو بدل کر دجلہ کے اوپر بابل کے قریب شہر بغداد کی بنیاد ڈالی اور اس کو اسقدر ترقی دی کہ اس نے بہت ہی تھوڑے زمانہ میں مشرق کے شہروں میں ایک عالمگیر شہرت حاصل کرلی اور بتدریج وہ دنیا کا عظیم ترین شہر بن گیا۔ جب خلیفہ ہارون الرشید بیس سال کی عمر میں سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے اپنے وسیع ملک کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے شروع کیا۔ تمام ملک میں سڑکیں بنوائی گئیں اور ڈاک قائم کی گئی۔ جن کے ذریعہ سے قاصد دور دور کے فاصلہ تک بآسانی اور بسرعت پہنچنے لگے۔ ہم کو کتب تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ نامہ بر کبوتروں کی ڈاک کا انتظام بھی اسی زمانہ میں نہایت اہتمام کے ساتھ شروع ہوا اور جس طرح یورپ میں محکمہ ڈاک کو اہمیت دیجاتی ہے اسی طرح بغداد میں بھی اس کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر تھا اور خطوط رسانی کا محکمہ ایک مہتم بالشان محکمہ خیال کیا جاتا تھا۔ ہر ایک صوبہ میں ایک والی یا گورنر تھا جس کے ہاتھ میں

صوبہ کی پوری حکومت ہوتی تھی۔ دور دراز ممالک مثلاً شمالی افریقہ وغیرہ کے والی یا گورنر خلیفہ کے قائم مقام ہوتے تھے اور ان کا عہدہ موروثی تھا اور وہ کسیقدر خود مختار بھی ہوتے تھے ملک کا مالی انتظام نہایت ہی باقاعدہ تھا اور آمدنی کے ذرائع حسب ذیل تھے:-

(۱) ذاتی و شخصی محصول (۲) مقبوضہ آراضی پر معمولی سا محصول

(۳) محصول جنگی (۴) محصول غیر مزروعہ آراضی پر

مورخین عرب لکھتے ہیں کہ خلافت کی مجموعی سالانہ آمدنی اس زمانہ میں دس کروڑ روپیہ تھی جو اس وقت ایک نہایت خطیر رقم خیال کی جاتی تھی۔ مالگذاری کی نگرانی ایک مجلس وزراء کے سپرد تھی جس کو دیوان کہتے تھے۔ ابن خلدون ایک بڑا مورخ اپنی تاریخ کے مشہور مقدمہ میں لکھتا ہے کہ انتظام مالگذاری کا دیوان اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ آمدنی کی نگرانی اور شاہی حقوق کی حفاظت کرے۔ اور آمدنی اور خرچ میں تناسب قائم رکھے اور فوج کی تعداد اور اس کی تنخواہ مقرر کرے۔ اس دیوان میں بہت ہی لائق محاسب رکھے جاتے ہیں اور ان کو منشیان دیوان کہتے ہیں۔ دیوان کا اطلاق اس عمارت پر بھی ہے جس میں وزراء جمع ہوتے ہیں۔

ملک کا انتظام چار محکموں پر منقسم تھا۔ اول محکمہ جنگ دوم محکمہ مالگذاری جس کا کام محصولات کا تعین کرتا تھا۔ سوم محکمہ شخصی جس کا منصب ان عہدہ داران کو

مقرر کرنا تھا جو محصولات کو وصول کریں اور چوتھا محکمہ انتظامی تھا جس کا کام آمدنی اور خرچ کی نگرانی تھی۔ خلیفہ کے تمام احکامات قلمبند ہو کر دفتر میں محفوظ رکھے جاتے تھے تاکہ خلفائے مابعد بآسانی ہر وقت ان کی طرف رجوع کر سکیں۔ ان تمام محکمات کا انتظام ایک وزیر اعظم کی سپرد ہوتا تھا جو بطور مدار المہام ہوتا تھا۔ اور بالعموم خلفاے وقت تمام امور ملکی کو اس کی ہی اعلیٰ قابلیت و حسن انتظام پر چھوڑ دیتے تھے۔

اسی طرح مثل محکمہ ڈاک خانہ شہروں کی نگرانی کا انتظام بھی کوتوال کے متعلق نہایت عمدہ طور پر تھا۔ تاجروں کی مجلسیں قائم کر دی گئی تھیں جن کا منصب یہ تھا کہ وہ معاملات تجارت کی جانچ پرتال اور فریب و دغابازی کا انسداد کریں۔ خلفائے عباسیہ کے آمدنی اور خرچ کے اعلیٰ انتظام نے انھیں بہت بڑے بڑے رفاہ عام کے کام کرنے کا موقع دیا تھا۔ چنانچہ ملک میں سڑکیں تیار کرا دی گئیں تھیں۔ کاروانسرائے۔ مساجد۔ شفاخانے۔ مدارس ہر طرف علی الخصوص بصرہ بغداد۔ اور موصل میں بکثرت قائم ہو گئے تھے۔ اسی طرح زراعت اور صنعت و حرفت نے بھی بڑی ترقی کی تھی۔ باریک اور عمدہ کپڑوں کے کارخانے موصل۔ حلب۔ اور دمشق میں اعلیٰ پیمانہ پر قائم تھے۔ نمک۔ گندھک۔ سنگ مرمر لوہے اور سیسہ کی کانیں بہت ہی باقاعدہ طور پر کھودی جاتی تھیں اور ان کی پیداوار مصرف میں آتی تھی۔ تعلیم عام کا محکمہ بھی ایک بہت وسیع اصول پر قایم

کیا گیا تھا۔ تمام حصہ عالم سے مشہور فضلا اور اساتذہ بلائے گئے تھے علم ہیئت کی اس درجہ ترقی ہوئی تھی۔ کہ وہ کام جس کو اس وقت اقوام یورپ نے زمانہ حال میں اختراع کیا ہے وہ کہیں پہلے ہو چکا تھا۔ مثلاً دائرہ نصف النہار کے ایک قوس کی پیمائش کی جا چکی تھی۔ قدمائے روم اور ایران کا کلام بالخصوص وہ کلام جو فلسفہ و ریاضیات سے متعلق تھا تمامتر بزبان عربی ترجمہ ہو چکا تھا اور کل مدارس میں پڑھایا جاتا تھا۔ زمانہ قدیم کی تحقیقات بھی جو یورپ میں کئی صدی بعد شروع ہوئی عربوں میں عام طور پر جاری تھیں۔ عربوں کے لیے حصول علم ایک بالکل نیا مشغلہ تھا جس میں اُنہوں نے نہایت شغف سے کام کیا اور بیحد مستعدی ظاہر کی چنانچہ عام کتب خانے علمی مدارس میں بکثرت ہر جگہ قائم ہو گئے تھے۔ علم حاصل کرنے کی خواہش اس درجہ تھی کہ خلفائے بغداد ہر ایک تدبیر سے دنیا کے مشہور علما اور اہل کمال کو اپنے دارالسلطنت میں جمع کرتے تھے۔ ایک خلیفہ نے تو شہنشاہ مشرق سے محض اس بنا پر اعلان جنگ کیا تھا کہ وہ ایک مشہور مہندس کو بغداد میں درس دینے کے لیے بھیجنے پر مجبور ہو جائے علما و فضلا ہر قوم و ہر مذہب کے یونانی۔ ایرانی۔ قبطی۔ کلدی اس شہر بغداد میں آکر جمع ہو گئے تھے اور اُنہوں نے اسے تمام دنیا کے علوم کا مرکز بنا دیا تھا۔ ابوالفرج ایک مقام پر لکھتا ہے کہ " ہارون الرشید کے بیٹے مامون الرشید کا یہ قول تھا کہ علما اللہ تعالےٰ کے ان خاص بندوں میں ہیں جن کو اس نے فہم و ادراک کو کامل کرنے کے لئے

انتخاب کیا ہے یہ لوگ دنیا کی مشعلیں اور رہبران نوع انسانی ہیں اگر یہ نہوں تو تمام دنیا اپنی وحشی حالت پر آجائے جبکہ خلفائے بغداد کے دربار میں اس قسم کے باکمال اشخاص موجود تھے تو پھر وہ کیوں نہ اپنے دارالخلافہ کو تمام عالم میں اول خیال کرتے اس دربار میں نہ صرف علم ہی کا چرچا تھا بلکہ اس کی شان وشوکت بھی بے انتہا تھی۔ ابوالفدا نے ۳۰۵ھ میں سفیر دولت مشرقی کے بغداد میں آنے اور اس کی پذیرائی کا حال لکھا ہے اس سے ہمیں بغداد کی مشرقی شان وشوکت کا اندازہ ہوسکتا ہے وہ لکھتا ہے کہ "خلیفہ کی تمام فوج کمربستہ تھی سوار اور پیدل کی جمعیت سولہ ہزار تھی۔ فوجی افسر زرق برق وردیاں پہنے اور پُرتکلف پرتلے لگائے ہوئے جن میں موتی اور سونا چمک رہا تھا اپنے افسر اعلیٰ کے گرد صف بستہ تھے۔ ان کے پیچھے سات ہزار خواجہ سرا تھے جن میں چار ہزار گورے چٹے تھے۔ ان کے بعد سات سو محلسرا کے محافظ تھے۔ مرصع کار کشتیاں دریائے دجلہ پر اپنے پھریروں کا لطف دکھارہی تھیں قصر شاہی کے اندر عجیب قسم کا تکلف تھا۔ اڑتیس ہزار مشجر کے پردے جابجا آویزاں تھے جن میں ساڑھے بارہ ہزار ریشمی کلابتون کے کام کے تھے۔ بائیس ہزار قالینوں کا فرش تھا۔ خلیفہ کے سامنے سو شیر ببر تماشہ کرتے تھے اور ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ محافظ تھے ایک درخت سونے اور چاندی کا تھا جس کی اٹھارہ شاخیں تھیں اور ان پر ہر قسم کی چڑیاں بیٹھی

زمرد سے سجی تھیں۔ درخت کے پتّے اور چڑیاں مختلف بیش بہا فلزات سے بنی ہوئی تھیں درخت بالکل قدرتی معلوم ہوتا تھا گویا ابھی جنگل سے اکھڑ کر آگیا ہے۔ ان تمام پرتکلف سامان آرائش میں سے گذار کر وزیر اعظم نے سفیر مشرقی کو خلیفہ کے تخت تک پہنچا دیا۔

خلفائے بغداد کی فوجی قوت کا اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ شہنشاہ قسطنطنیہ جو یونان و روم کے جانشین تھے خلیفہ کو لازمی طور پر خراج دیا کرتے تھے۔ نیسی فورس نے جو شہزادی آئرنی کے بعد تخت نشین ہوا۔ خلیفہ ہارون الرشید کو لکھا کہ میں آیندہ سے خراج نہ دونگا۔ اس کے جواب میں جو خط خلیفہ نے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین روم و یونان کی تخت نشین اولاد کس طرح عربوں کی نظروں میں ذلیل و رسوا تھی چنانچہ وہ جواب یہ ہے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ہارون الرشید امیر المومنین کی جانب سے بنام رومی کتے نیسی فورس کے۔ او کافر کے بچے! میں نے تیرا خط پڑھا۔ میرے جواب کا متوقع نہ رہ تو خود دیکھ لے گا کہ کیا ہوتا ہے" اور فی الواقع اس سگ رومی نے دیکھ بھی لیا۔ ہارون الرشید نے اس کے تمام ملک کو زیر و زبر کر ڈالا اور اس عیسائی شہنشاہ قسطنطنیہ کو خلیفہ اسلام کی بارگاہ میں خراج دینا ہی پڑا۔

یہاں تک تو عربوں کے معاشرتی و ملکی تمدن کا بیان تھا اب ہم ان کے علوم فنون اور دیگر محاسن کا ایک سرسری خاکہ کھینچتے ہیں علم ادب یعنی ان کی اپنی

عربی زبان درحقیقت خود آنحضرت صلعم کی بعثت کے قبل ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ حماسہ کے اکثر اشعار سبعہ معلقہ دیوان نابغہ وغیرہ وغیرہ یہ سب عہد جاہلیت کے شعرا کا نمونہ ہیں۔ عکاظ جو مکہ سے تین دن کی راہ پر ایک قصبہ ہے۔ وہاں شعرائے عرب کا اجتماع ہوا کرتا تھا اور ان میں کے بہترین اشعار خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں کر دیئے جاتے تھے۔ لیکن نثر میں اس وقت تک کوئی خاص کمال پیدا نہوا تھا۔ اور نہ اس وقت کوئی ممتاز ناثر تھا۔

بنی امیہ کے دور خلافت میں اکثر اہل کمال پیدا ہوئے اور بنی عباس نے تو شعرا اور اہل ادب سے تمام ملک کو بھر دیا۔ فن ادب میں بھی مختلف شعبے ہوگئے اور نظم و نثر۔ ضرب الامثال۔ معانی و بلاغت۔ اور لغت میں الگ الگ کمال پیدا کیا جانے لگا۔ چنانچہ جاحظ۔ شیخ عبدالقاہر جرجانی۔ ابوالقاسم حریری۔ بدیع الزماں ہمدانی۔ ابوالفرج اصفہانی وغیرہ یہ سب ادب کے مختلف شعبوں کے امام ہوئے۔

اسی طرح نظم میں حسان بن ثابت۔ اعشیٰ۔ عروۃ الورد۔ ابوالعلا معرّی۔ ابونواس۔ متنبی۔ قطری بن الفجاءہ دیگر بیشمار شاعر نامور پیدا ہوئے۔ اور یہ مذاق عرب کے خمیر میں داخل ہوگیا۔ ان کا بچہ بچہ اس سے واقف تھا اور یہ جس ملک میں گئے یہ فن لطیف ان کے ساتھ گیا۔ چنانچہ یورپ نے اس فن کو اندلس کے عربوں سے سیکھا اور ان کی شاعری کا ماخذ، عرب شعرا کے کلام ہیں۔

ردیف اور قافیہ کا استعمال بھی عربوں ہی کے ذریعہ سے یورپ نے پایا اور استعمال کیا۔

علم منطق اور فلسفہ جس کو عربوں نے یونان سے ترجمہ کیا تھا وہ وہیں تک محدود نہ تھا بلکہ ان میں بہت حصہ ان کی ذاتی سعی و کاوش کا تھا۔ یونان کے ماہرین ارسطو۔ ڈاکلینز۔ ہرقل۔ سقراط۔ اپیکیورس اور کل فلاسفروں کی تصانیف عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں اور وہ اپنی ذاتی محنت سے اپنے استادوں سے کہیں زیادہ بڑھ گئے تھے۔ سب سے بڑی بات جو انہوں نے پیدا کی وہ یہ تھی کہ تقلید کو چھوڑ کر انہوں نے اس میں اجتہاد کیا اور اقوال و آراء کو پس پشت ڈال کر تجربہ اور مشاہدے سے کام لینا شروع کیا۔ تجربات اور مشاہدات کو اقوال علما کے مقابلہ میں اصل علمی تحقیق قرار دینا بیکن مشہور فلسفی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ ہر وہ شخص جس کو عربی فلسفہ سے کچھ بھی ذوق ہے جانتا ہے کہ ان کا طریقہ معلوم سے غیر معلوم کا حاصل کرنا۔ واقعات و حوادث کا صحیح مشاہدہ کر کے اس کی علت بتانی اور قضایای کاذبہ سے اجتناب اور انہیں غیر صحیح الانتائج سمجھنا انہیں عربوں نے بتائے اور جاری کئے اور یورپ نے اس طریقہ کو عرب ہی سے سیکھا۔ اس لئے کہ یورپ کی ازمنہ متوسطہ کی یونیورسیٹیاں اس عملی تجربہ سے خالی تھیں اسلام میں مشہور فلسفی۔ ابن رشد۔ امام غزالی۔ امام فخر الدین رازی بوعلی سینا وغیرہ

بہت نامور گزرے ہیں۔یورپ کی یونیورسٹیاں مدتوں تک انہیں کے فلسفہ کا سبق پڑھتی رہیں خصوصاً ابن رشد کا فلسفہ تو سترھویں اٹھارھویں صدی تک یورپ میں پڑھا جاتا رہا ہے۔ریاضی و نیت کا فن تو یونانیوں کے وقت کا ایجاد کردہ شمار کیا جاتا ہے۔لیکن عربوں نے جو بے نظیر ترقی اس فن میں کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔اس فن کا رواج اس قدر ہوا کہ عربوں کے بعد اکثر اسلامی بادشاہوں نے اپنی فیاضیوں سے اس کی ترویج میں بڑی مدد کی۔عربوں کے عروج کے زمانہ میں یوں تو اس کا اصلی مرکز بغداد کو قرار دیا جاسکتا ہے لیکن سمرقند۔دمشق۔قاہرہ۔فاس۔طلیطلہ۔قرطبہ۔یہ سب شہر بھی اس کے مرکز رہ چکے ہیں۔

علم نجوم اور علم الافلاک میں جسقدر اختراعات و ایجادات عربوں نے کیں اس کے لیے مستقل ایک تصنیف درکار ہے لیکن فی الحال صرف ان مشہور و معروف ہندسوں کے ناموں پر ہی کفایت کی جاتی ہے جو اس فن میں اُستاد مانے گئے ہیں۔باوجود مختلف قسم کی بربادیوں اور تباہیوں کے یہ علم مسلمانوں کی تحقیقات کا آماجگاہ اور زیر بار احسان رہا ہے اور بغداد ہی میں سات صدی تک برابر اس کی تعلیم دیجاتی رہی۔پہلا شخص محمد بن جبر البتانی ہے یہ تمام ہندسین کا امام مانا جاتا ہے اور اس نے تیسری صدی ہجری میں رحلت کی۔ابن اماجور اور موسیٰ ابن شاکر مورخ کے تین بیٹے۔محمد۔احمد۔اور احسن کے نام سے

مشہور ہیں۔ اور یہ تینوں بڑے مہندس شمار کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح ابوریحان محمد البیرونی ہے جو علم ہیئت کا بڑا عالم تھا۔ اس نے دنیا کے مشہور مقامات کا سفر کیا اور ہندوستان میں آکر ہندوؤں سے ان کی زبان ان کے علوم وفنون۔ فلسفہ۔ ادب۔ ان کے اوضاع و اطوار۔ رسم رواج ان کے قوانین ومذہب اوران کی ضعیف الاعتقادی کا بغور مطالعہ کیا اور پھر ہندوؤں کو بغداد کے مہندسین کی تحقیقات سے مطلع کیا اور اپنے مشاہدات کو قلمبند کیا جو اس کے سفرنامہ کے نام سے مشہور ہے۔ ابن ہشیم مصری یہ بھی دنیا کے ممتاز مہندسین میں سے ہے اس کی کتاب "کتاب المرایا والمناظر" دنیا کی اس فن میں بہترین کتابوں میں سے شمار کی جاتی ہے جس کا قلمی نسخہ مصر کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

علم جغرافیہ اگر بنظر تحقیق دیکھا جائے تو وہ علم ہے جس کی نہ صرف ایجاد و اختراع کا بلکہ اس کو کمال اور انتہا تک پہنچا دینے کا فخر صرف قوم عرب کو ہی حاصل ہے لیکن آج کوئی عربی داں معلم یا متعلم اس کی معمولی واقفیت کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ علم جغرافیہ کے متعلق کچھ معلومات ایک عرب تاجر سلیمان کے سفرنامہ سے ملتے ہیں اور غالباً سب سے پہلا جغرافیہ وہی سفرنامہ ہے۔

مسعودی۔ یہ بھی ایک بڑا جغرافیہ دان ہے اور "مروج الذہب" جس میں منجملہ دیگر مضامین کے ملکوں کی حالت۔ پہاڑ۔ سمندر۔ بادشاہی خاندان اوران کی اقوام کے شعبے وغیرہ معلوم ہوتے ہیں۔ ابن حوقل۔ البیرونی۔

ابوالحسن علی بن ابی القاسم بن ماجور۔ ابن بطوطہ۔ الاصطخری۔ اور ادریسی یہ سب بڑے جغرافیہ داں اور جغرافیہ نویس ہوئے ہیں۔ مصری شاہی خاندان کے ایک فرد کے سفرنامہ میں جو انہوں نے یورپ سے واپس آکر "الدنیا فی بارہیں" کے نام سے شائع کیا ہے ایک فہرست مسلمانوں کے مختلف علوم وفنون کے کتابوں کی درج ہے اس میں زمخشری کی ایک کتاب "کتاب الامکنہ والجبال" کا نام بھی لکھا ہے جس سے اس مشرقی عالم کی علم جغرافیہ سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب المناظر میں روشنی اور شعاعوں سے بھی پوری بحث کی گئی ہے۔ اور مستقیم۔ منعکس۔ منعطف شعاعوں کی نہایت خوش اسلوبی سے بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح جرثقیل کے مختلف آلات جو عربوں نے ایجاد کئے تھے وہ اگرچہ ہم تک نہیں پہنچے لیکن اکثر تصانیف سے ان کا پتہ چلتا ہے گھڑی کے لنگر کا ایجاد کرنا اور خود گھڑی کی اختراع ایک عرب کے سفرنامہ سے معلوم ہوتی ہے۔

جابر ابن حیان ایک مشہور کیمیا داں ہے اور مختلف نامعلوم اجزاء کو معلوم کر کے اس نے ان کے خواص کی تحقیق کی ہے اور وہ بڑے بڑے مرکبات جن سے یونانی بالکل ناواقف تھے۔ مثلاً الکحل۔ گندھک کا تیزاب وغیرہ عربوں نے ہی ایجاد کیا۔ جابر کی اکثر تصانیف ضائع ہو گئیں لیکن ان میں سے صرف چند کا پتہ چلا ہے۔ الرازی بھی علم کیمیا کا ایک بڑا ماہر گذرا ہے

جس کی مشہور تصانیف۔ الحاوی ۔ الجامع ۔ کتاب الاقطاب اور منصوریہ ہیں۔ فنون و اکتشافات عربوں کی بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ عملی طور پر علوم سے حرفت کا کام لیا کرتے تھے اور انہوں نے اپنی صنعت و حرفت میں نمایاں ترقی پیدا کرلی تھی۔ چنانچہ گندھک پارے۔ تانبے۔ لوہے اور سونے کی کانوں کو وہ نکالنا جانتے تھے۔ ان کو رنگ سازی میں بھی کچھ کم کمال نہ تھا۔ فولاد کو آب دینے میں ماہر تھے جیسا کہ طلیطلہ کی تلواروں سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کے بنے ہوئے کپڑے۔ ہتھیار۔ دباغت چرم اور کاغذ تمام دنیا میں اس وقت مشہور تھے۔ عربوں کی ایک بڑی دقیق ایجاد بارود بھی شمار کی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ بندوق اور توپ کے اختراع بھی عربوں سے ہی منسوب کی جاسکتی ہے۔ جہازرانی میں قطب نما کا ایجاد بھی انہیں کا حصہ ہے جس کے بعد یورپ نے اس میں ترقی کی ہے۔

یہ ہے وہ تصویر اسلام جو انقلاب زمانہ کے پرآشوب حالات سے گردآلود ہوگئی ہے لیکن تاریخی واقعات اور صیقل علم اس کو اپنی اصلی صورت میں دکھا سکتے ہیں یہ تصویر اس صانع قادر کی بنائی ہوئی ہے جس کے سامنے دنیا کی دوسری متمدن اقوام کی تصاویر سب ہیچ ہیں لیکن دیکھنے والوں کو نظر بصیرت کی ضرورت ہے۔

ہم نے اسلام کو ہر پہلو سے غور کرلیا۔ اور تمدنی اور معاشرتی سب شعبوں کے اصول

اوران پر کاربند ہونے والے حضرات نے بھی مشاہدہ کرلیا ہم نے ایک بادشاہ وقت سے لیکر ایک ادنیٰ رعایا تک کو اسی ایک تمدنی اصول کے سلاسل سے منضبط پایا اور حفظ مراتب میں ایک دوسرے کا معین دیکھا۔

ہم نے برائے العین مشاہدہ کیا ہے کہ اسلامی اصول انسانی زندگی کے بالکل مطابق ہیں اسلام نے انسانی ترقی کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی ہی بلکہ تمام امور کے قوانین منضبط کر دیئے ہیں اور انسانی نفس کو ان تمام زنجیروں سے آزاد کر کے جنمیں وہ جکڑا ہوا تھا حکمت اور اعتدال کے ساتھ آزادی دیدی ہی۔ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اصل دین اسلام چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہی اور وہ عقائد۔ عبادات۔ معاملات۔ آداب معاشرت اور اخلاص باطنی ہیں۔ فی الحقیقت تمام اصول تمدن پر بھی پانچ چیزیں حاوی ہیں اب جو اقوام ان میں سے سب پر عامل نہوں گی کماحقہ متمدن کہلائے جانے کی کسی طرح مستحق نہیں ہوسکتیں۔ چونکہ امن عامہ اور تمدن صرف اس وقت باقی رہ سکتا ہے جبکہ اخلاق درست ہوں اور اخلاق کی کامل درستی صرف اس وقت ہوسکتی ہے جب عقائد درست ہوں اسی طرح یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ اخلاق میں بڑی چیز تواضع اور اس کی ضد تکبر و نخوت نااتفاقی کی جڑ ہے اور تواضع صرف دین قائم کرنے سے ہی پیدا ہوسکتی ہے۔ اسی طرح اخلاق میں جھوٹ نہ بولنا۔ صداقت۔ ہمدردی بنی نوع اور خودغرضی سے اجتناب سب داخل ہیں اور اصول تمدن کے بڑے رکن ہیں جن پر تمام دنیا کا مدار ہے لیکن واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہی اخلاق حمیدہ کسی دو لیسے اشخاص

میں پائے جائیں جن میں سے ایک تو توحید و رسالت کا قائل ہو اور دوسرا اس کا قائل نہ ہو تو یقیناً دونوں میں ایک بیّن فرق ہو جائے گا یعنی منکر توحید و رسالت میں تو یہ اخلاق محدود العمر ہونگے۔ یعنی جب تک ان اخلاق پر عمل کرنے سے ان کے دنیوی منافع فوت نہوں یا ان کے خلاف عمل کرنے سے دوسروں کو خبر ہو کر بدنامی کا اندیشہ نہو اس وقت تک وہ اخلاق ان کے نزدیک قابل عملدرآمد ہونگے اور اگر کوئی ایسا موقع پیش آجائے گا کہ ان پر عمل کرنے سے دنیوی ضرر ہوتا ہو اور ان کے خلاف کرنے میں کسی کو خبر بھی نہو جس سے دنیوی بدنامی کا اندیشہ ہو تو اس منکر توحید و رسالت کو کبھی ان اخلاق کے ترک کی پرواہ نہو گی چونکہ پھر کوئی قوت اس کو باز نہیں رکھہ سکتی۔ چنانچہ اس اصول کے بنا پر مہذب و شائستہ اقوام میں جن کو اپنے اصول تمدن پر ناز ہے اکثر ایسے ایسے جرائم ہوتے ہیں جو کسی متمدن قوم میں جائز نہیں ہو سکتے۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین سلطنتوں میں معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی پابندی صرف اس وقت تک کی جاتی ہے جب تک ذاتی منافع حاصل ہونے میں یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر ہوتا ہے لیکن اس کے خلاف عہد شکنی میں ذرا تامل نہیں ہوتا۔ لیکن ایک دیندار محض خدا کی وجہ سے کبھی عہد شکنی کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اور مفاد کا قائل مستقبل کے خوف سے اپنے ایفائے وعدے میں حتی الوسع کوشاں رہتا ہے۔

فرض کرو کہ دو شخص ہم سفر ہوں جن میں سے ایک کے پاس ایک ہزار کے

نوٹ ہوں اور دوسرا محتاج محض ہو راستہ میں متمول شخص کا انتقال ہو جائے اور مفلس کو اپنے ساتھی کا مال ملجائے اور اس کی خبر بھی کسی کو نہونے پائے تو اس وقت قوت اخلاقیہ اور نفس میں باہم جنگ ہوگی۔ اخلاق کا فتویٰ یہ ہوگا کہ روپیہ وارث مستحق کو دینا چاہیئے اور نفس کا فیصلہ اس کے بالکل خلاف ہوگا۔ اس موقع پر محض اخلاقی تعلیم رہبری کبھی نہیں کر سکتی چونکہ مخلوق کے خوف کا اس کو بالکل اندیشہ نہیں ہے یہاں پر صرف وہی شخص بازی لے سکتا ہے جس کے دل میں خوف خلق کے بجائے خوف خالق جاں گزیں ہو اور وہ صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو توحید و رسالت کا قائل ہو۔

اس مثال سے واضح ہو گیا کہ تمدنی زندگی کی تکمیل کے لیے اسلام کی کس درجہ ضرورت ہے مختصر یہ ہے کہ اسلام کے جسقدر اصول ہیں وہ سب اخلاق کی مکمل طور پر تعلیم دیتے ہیں اور غیر متمدن اقوام کو متمدن بنانے کا اصل ذریعہ ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ قوم جسکی کتاب آسمانی رب زدنی علما کے ورد کی تعلیم دے وہ قوم جس کا نصب العین اطلبوا العلم ولوکان بالصین ہو۔ وہ قوم جو حکمت کو اپنا گم شدہ لال سمجھکر اس کی تلاش میں سرگرداں رہی ہو۔ وہ قوم جس کے طالب علم کی دوات کی سیاہی خون شہدا کا درجہ رکھتی ہو۔

وہ قوم جس کے ہاں ایک علمی مسئلہ کا اخذ کرنا قیام لیل سے بہتر خیال کیا گیا ہو۔ وہ قوم جس کے علمی کارنامجات کا صرف ایک ورق فی المعنی دنیائے سلف کے تمام کتب خانوں سے افضل و اعلیٰ ہو۔ وہ قوم جو بڑی شد و مد سے ؎

پئے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

کی قائل ہو وہ قوم جس نے دنیا کو فنون تاریخ اور اسمائے رجال سے آگاہ کیا ہو اور جس کا ایک معمولی فرد آج اس عالمگیر روشنی کے زمانہ میں ابوالتاریخ کے ممتاز لقب سے ملقب ہو۔ وہ قوم جس نے احمد ہمدانی۔ نشوان بن سعد حمیری صاحب شمس العلوم۔ واقدی۔ ابن اسحاق۔ ابن ہشام۔ ابن قتیبہ۔ بلاذری۔ طبری ابو الفداء۔ ابن اثیر۔ مقری اور ابن خلدون جیسے مورخین پیدا کئے ہوں وہی قوم آج تاریخ عالم تو ایک طرف خود اپنی ہی تاریخ سے لاعلم اور اپنے کارناموں سے محض نابلد ہے۔

اور باوجود ان تمام باتوں کے ہم دیکھتے ہیں یہی مسلم قوم ہر جگہ سب سے زیادہ پستی میں نظر آتی ہے اور ہر چہار طرف سے اس پر لعن وطعن کی بوچھاڑ ہوتی ہے تو اب فطرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس تنزل اور انحطاط کا سبب کیا ہے؟ اس سوال کا حل افراد قوم کی موجودہ حالت کی سیر ہے جب ہم موجودہ قوم کے افراد پر مجموعاً نظر ڈالتے ہیں تو یہ سوال خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ اس وقت مدعیان اسلام

نے بلحاظ تنا فر و تحاسد ان تمام اصول اسلامی کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اسلام کے حقیقی شاہراہ سے اپنی جہالت کی تاریکی میں کوسوں دور ہٹ گئے ہیں اس وجہ سے معصیت اور بے دینی کی گھٹائیں اسلامی عالم پر محیط ہیں۔ قومی رسوم اور مغربی معاشرت اس درجہ سرایت کر گئی ہے کہ اپنے اسلاف سے بالکل بےخبر ہیں۔ تمدن۔ وسیاست۔ معاملات و معاشرت اس قدر بگڑ گئے ہیں کہ اکثر زبانیں متفق اللفظ اس کی قائل ہیں کہ اسلام صرف۔ نماز روزہ اور جنت غیبی چیزوں۔ بہشت کی حوروں اور دوزخ کے کیڑوں مکوڑوں کے تذکرہ کا نام ہے انسانی معاش اور گذران حیات یا دیگر ظاہر و باطن اخلاقیات سے کوئی علاقہ ہی نہیں ہے کھانا۔ پینا۔ اُٹھنا۔ بیٹھنا۔ ملاقات۔ معاملات حسن سلوک وغیرہ وغیرہ سب سے بالکل آزاد ہیں اگر کبھی تمدنی رسوم میں پابندی بھی کی تو ان اقوام کی جن کو مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اور اگر طرز معاشرت یا انداز نشست و برخاست میں اتباع کیا تو ان کا جو اصلاح کے پردے میں تخریب کے درپے ہیں۔ بجائے اس کے کہ خذ ما صفا دع ما کدر کے اصول پر کاربند ہوں کورانہ تقلید میں اپنے آپ کو برباد کر لیا۔ بددینی کا نام دین۔ بربادی کا نام شادی۔ جہل کا نام علم شعبدے بازی کا نام کرامات ہو گیا ہے نہ اخلاق کی تفہیم نہ الوہیت و رسالت کی تعظیم نہ آداب و مقامات کی تتمیم ہے۔

ہر شخص کو توبہ و خوف۔ زہد و اتقا۔ صبر و شکر۔ اخلاص و صدق۔ توکل و

رضا کی بجائے حسد و بغض بخل و حب مال رعونت و حب جاہ ریا و درشتی پر بیجا ناز ہے۔

ہم تہذیب و شائستگی۔ روشن خیال و روشن ضمیری کے مدعی ہیں اور کائنات دنیا کے انکشاف کرنے میں شائستہ لوگوں کے مقلد ہیں۔ ہم اسپنسر اور میو ہیڈ کی تمدنی تھیوریوں۔ ڈاروِن اور ہکسلے کے قائل ہیں۔ کانڈرس اور روسیراش کے سیاسی اور مذہبی مسائل کے مداح ہیں لیکن ہم اپنی اس عظیم الشان آسمانی کتاب اور مقدس اقوال نبوی کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جن کی عجیب و غریب حکمتوں کے دریافت کرنے میں اگر یہ علما اپنی تمام عمریں بھی صرف کر دیں تو ان کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ اگر ہم اپنے مکمل اسلامی قانون کو دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو گوشہ نشینی اور گمنامی۔ تعصبات مذہبی اور ذلت و خواری یا ناقابل برداشت عبادات و ریاضات کا حکم دیتا ہوا ور جو موجودہ یا آیندہ تمدن کے منافی ہو بلکہ وہ ایسا مذہب ہے جو محنت و کوشش اور کام کرنیکے لیے انسان کو آمادہ کرتا ہے اور علو ہمتی اور اولوالعزمی کے ساتھ عزت و عظمت رفعت و وقعت حاصل کرنے کی ترغیب و تحریص دیتا ہے۔

اسلام سے قبل اقوام کی جہالت کو غور کرو اور اس کے بعد دیکھو کہ محض اسلام کی وجہ سے ان میں کسقدر عظیم الشان اور فوری تغیر ہو گیا۔ اس گروہ میں ہم کو ایسے لوگ نظر آئیں گے جو بلحاظ پرہیزگاری و وقار فرشتوں سے اور بلحاظ ہمت و اقتدار کسریٰ و قیصر سے فائق ہیں۔ انہوں نے علوم اخلاق اور تمدن معاشرت کی تعلیم کونسی یونیورسٹی

میں پائی تھی؟ یا سیاسی علوم کونسے علمی جلسوں اور پارلیمنٹوں میں سیکھے تھے؟ ان کے قوانین کی تعلیم کے لیے کونسے کالج کھلے ہوئے تھے جہاں سے وہ اسقدر بلند پایہ مقنن ہوئے کہ دنیا کو متحیر کر دیا اور آج عالم میں ان کی نظیر نہیں ملتی؟ ان کی ظاہری اور باطنی تعلیم و تربیت کے لیے صرف وہ ایک آسمانی کتاب تھی جس کو آج ہم نے پس پشت ڈال رکھا ہے اور دوسروں کے ملمع شدہ قوانین پر کاربند ہو کر ان کے محتاج ہو رہے ہیں اور قعر مذلت میں گرتے جا رہے ہیں اور یہ نہیں خیال کرتے کہ ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ اس کا نتیجہ ہے کہ ہم نے جان بوجھ کر الہام الٰہی کی پرواہ نہیں کی ہے جس کے صریح الفاظ یہ ہیں کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَمَا لَھُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ۔

ہم اگر آج احکام خداوندی کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جائیں تو پھر اپنے اسلاف کی طرح ترقی کے تمام منازل طے کر سکتے ہیں چونکہ ؎

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹	۱۷	براء العین	برائے العین	۲۴	۱۷	نافع اللغیر	نافع لا للغیر
۱۰	۵	کردیتا ہے	کردیتا تھا	۲۸	۷	فضائل سے	فضائل سے مملو ہے
〃	〃	ہوتا ہے	ہوتا تھا	〃	۱۱	Philosophy	Philosophers
〃	۱۴	عقلی دماغی	عقلی اور دماغی	۲۹	〃	بہتے ہیں	رہے ہیں
۱۱	۴	صدی کے	صدی میں	۳۱	۱۴	ہوجاتا ہے	ہوجاتا ہے تو
〃	۱۲	ہدات	ہدایت	〃	۱۵	تغذیہ ہوجاتا ہے	تغذیہ بند ہوجاتا ہے
۱۵	۱۰	درکند	درکند	۳۲	۱۱	تمدن کہ	تمدن ہوتا ہے۔ یہ کہ
〃	۱۴	عظیم الجتہ	عظیم الجثہ	۳۴	۷	اسی ضروریات	تمام ضروریات
۱۹	۱۱	علامہ ریش	علامہ ویریش	۳۵	۱۴	پاتی ہیں	پاتی ہے
〃	۱۵	سوکھتے ہو	سوکھتے رہو	۳۶	۱۲	نہ ہوں گی	نہ ہوگی
۲۱	۲	وہ اعتقادات	یہ وہ اعتقادات	۴۱	۱	وصول	حصول
〃	۱۱	علامہ جیلر	علامہ جبیلر	۵۱	۱۴	خابج	خارج
۲۳	۷	کیوں نہ دے	کیوں نہ کرنے	۶۰	۵	برامین	براہین
〃	۱۵	براحت آسائش	براحت و آسائش	۶۱	۱۷	دختران کو	دختران خدا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
٦٢	٢	معشرتی	معاشرتی	٨٨	٤	علمی	عملی
"	١٤	مکہ طلوع	مکہ سے طلوع	٨٩	١٢	لغوی	سفوی
٦٣	١٧	حمیدہ اوصاف	حمیدہ اور اوصاف	٩٠	٦	لغت	لُغات
٦٤	٧	جنسوں	بیتقیت،	١٠٠	٥	ضنبل	ضنبل
"	١٩	لوگوں	لوگ	١٠١	١٤	چھوڑوں	چھوڑونگا
٦٥	٩	اس	ان میں	١٠٢	١١	ان	ان کی
٦٩	١	مسٹر	مسز	١٠٣	١١	سرتاآ	سرتاپا
"	١٧	اکثرچہ	اگرچہ	١٠٧	١٧	بندرگاہوں	بندرگاہوں کی
٧١	١١	نتیجہ ظلم	نتیجۂ ظلم	١٢٠	٦	معشرتی	معاشرتی
٧٤	٥	کی	کے	١٢٢	١	حضرات نے	حضرات کو
٧٨	١٧	جلال	حلال	"	١٠	بھی	یہی
٧٩	٢	بھی	بجی	١٢٧	٣	میوہیڈ	میورہیڈ
٨٦	١٤	متاہد	مشاہد	٠	٠	٠	٠